ہندوستان کی
پہلی اسلامی تحریک

یعنی

حضرت سید احمد شہیدؒ اور ان کے ماننے والوں کی چلائی ہوئی تحریکِ
تجدید وجہاد کی تاریخ اور ان کے کارناموں پر تبصرہ اور تنقید
نیز غیروں کی غلطیوں اور فروگزاشتوں کی نشاندہی اور تردید

تالیف

مولانا مسعود عالم ندوی

فہرست مضامین

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عرضِ مؤلف

آج سے نو دس برس پیشتر (۱۹۳۵ء / ۱۳۵۴ھ) جب راقم نے عربی زبان میں اسلامی ہند کی تاریخ[1] لکھنا شروع کی، تو ہندوستان کی مشہور اور بدنام وہابی تحریک سے ابتدائی واقفیت پیدا ہوئی۔ دو چار کتابیں دستیاب ہو سکیں، دیکھیں اور "الحرکۃ الوھابیۃ الھندیۃ السیاسیۃ" کے عنوان سے زیرِ تحریر تاریخ میں ایک باب کا اضافہ ہو گیا جس کا ایک ٹکڑا مرحوم "الضیاء" کے آخری نمبر (شعبان ۵۴ھ۔ دسمبر ۳۵ء) میں شائع بھی ہوا تھا۔ پھر وہی مقالہ اردو کے لباس میں (وہابیت: ایک اہم دینی و سیاسی تحریک) کی سرخی کے ساتھ الہلال (پٹنہ) کی متعدد اشاعتوں میں شائع ہوا (اپریل، مئی، جون ۳۷ء) اور خود اس تحریک کے مرکز عظیم آباد اور خاص کر صادق پوری حلقوں میں بھی تحسین و قبولیت کی نگاہوں سے دیکھا گیا۔ اس سے سمندِ شوق کو ایک اور تازیانہ لگا اور مزید چھان بین جاری رہی۔

حسنِ اتفاق کہ ان ہی دنوں میں محبِ مخلص مولانا ابوالحسن علی ندوی، حضرت سید شہیدؒ کی سیرت مرتب کرنے کا ارادہ کر رہے تھے۔ اس لئے بحث و مذاکرہ کے بعد دو دوستوں کے درمیان یہ طے پایا کہ علی میاں سید صاحبؒ کی سیرت کو مرتب کریں اور یہ گنہگار مشہد بالاکوٹ (۱۲۴۶ھ ــ ۱۸۳۰ء) سے اپنا قلمی سفر شروع کرے۔ ان دونوں میں جو علم و عمل کا جامع، مستعد اور سراپا سوز و درد تھا، اس نے اپنا کام جلد ختم کر لیا جس کا معمولی ثبوت یہ ہے کہ ان سطروں کے لکھنے سے بہت جلد پہلے سیرت

---

[1] نام مسلمی الہند و غابرہم

سید احمد شہیدؒ کے دو اڈیشن نکل کر قبولِ عام کی سند حاصل کر چکے ہیں۔ اور کیا عجب ہے کہ تیسرا اڈیشن بھی بہت جلد منصۂ شہود پر جلوہ گر ہو جائے۔

اس بے عمل کا دائرۂ عمل نسبتاً اُلجھا ہوا اور پُرخطر بھی تھا۔ حکومتِ وقت کے خوف سے معاصر اور آزاد باخبر حلقوں نے کوئی یادداشت محفوظ نہیں رکھی اور تو اور صادق پور میں بھی کوئی معقول تحریری مسالہ موجود نہیں۔ سننے اور دیکھنے والے آنکھیں بند کر چکے۔ اور ایک آدھ واقف کار نظر بھی آئے تو پہلی سختیوں کا رعب دل پر اب تک بیٹھا ہوا۔ عظیم آباد پٹنہ میں سات سال مسلسل قیام (۱۹۳۸ء تا ۱۹۴۴ء) اور ایک مشہور اور قیمتی کتاب خانے (خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ) کی تمام آسانیوں کے باوجود مواد کے فراہم اور تلاش کرنے میں بڑی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اور سات آٹھ سال کی مسلسل جدوجہد کے باوجود بعض گم شدہ کڑیوں کا سراغ اب تک نہیں مل سکا۔ مجبوری میں جو کچھ ہو سکا، حاضرِ خدمت ہے۔ مزید چھان بین کا سلسلہ جاری ہے اور رہے گا۔ اللہ نے چاہا تو دوسرے اڈیشن میں یہ کوتاہیاں دُور ہو جائیں گی۔

—————(۲)—————

حضرت سید شہیدؒ کی تحریکِ تجدید و جہاد یا ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک عام طور پر وہابی تحریک کے نام سے یاد کی جاتی ہے اور اپنوں اور غیروں، تمام حلقوں میں یہ کوشش کی جاتی رہی ہے کہ نجد کی دعوتِ توحید و اصلاح سے اس کا ڈانڈا ملا دیا جائے۔ ہر چند کہ دونوں تحریکوں کا سرچشمہ (کتاب و سنت) ایک ہے اور رجحانات بھی ملتے جلتے ہیں، پھر بھی یہ واقعہ ہے کہ دونوں کی نشوونما الگ الگ ہوئی اور ایک پر دوسرے کا کوئی اثر نہیں پڑا۔ اس تحریک کے مطالعے کے دوران میں نجد کی دعوتِ توحید کے متعلق ایسی غلط بیانیاں بلکہ زہر افشانیاں اور دشنام طرازیاں نظر سے گذریں کہ یارائے ضبط نہ رہا، اور نجد کی دعوتِ تجدید و اصلاح نے کچھ عرصے کے لئے توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ اور اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ زیرِ نظر کتاب سے پہلے دعوت نجد کی تاریخ، محمد بن عبدالوہاب —— ایک مظلوم اور بدنام مصلحؒ کے نام سے مکمل ہو گئی۔

گو اس رسالے کا اصل موضوع ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک اور اس میں بھی خاص کر مشہد بالاکوٹ کے بعد کے واقعات و حالات کا جائزہ لینا ہے۔ تاہم ربطِ کلام، اور 'وہابی تحریک'، نام کی شہرت کے باعث، حضرت سید احمد شہیدؒ کی سیرت اور 'وہابیت' پر دو باب شروع میں بڑھا دیئے گئے ہیں۔ ہر چند کہ لفظ 'وہابیت' کا اطلاق دنیا کی کسی تحریک پر صحیح نہیں۔ نجد کی دعوت کے علم بردار شیخ الاسلام محمد احمد عبدالوہابؒ کی طرف اگر نسبت کرنا ہو تو محمدی کہنا چاہیئے۔ علاوہ بریں ان کے ماننے والے عام طور پر اپنے کو 'حنبلی' کہتے ہیں۔ علمائے حنابلہ کی کتابوں پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوگا کہ محمد بن عبدالوہابؒ نے ان سے زیادہ ایک حرف نہیں کہا۔ البتہ عزم و عمل کی مردہ قوتوں کو بیدار ضرور کیا۔ بے دار پیکروں میں زندگی کی حرارت ڈال دی اور ایک پورے خطے کو اسلامی رنگ میں شرابور کر دیا۔ اور آپ جانتے ہیں، یہ ایسا گناہ ہے، جسے شاطرانِ فرنگ اور اُنکے ہواخواہ معاف نہیں کر سکتے۔

نجد کے بعد 'وہابیت'، کا لیبل سید شہیدؒ کے ماننے والے ہندوستانی مجاہدوں پر بھی لگایا گیا، جو بار بار کی تردید کے باوجود آج بھی قائم ہے اور یہ "گالی" اتنی مشہور ہو چکی ہے کہ بعض اچھے خاصے مخلص مسلمان بھی 'مجاہدین'، کو وہابی ہی کے نام سے جانتے ہیں اور اس سوختہ سامان نے تو اب تنگ آکر اس لقب 'وہابی'، سے گھبرانا بھی چھوڑ دیا ہے۔ اچھا صاحب! اگر اللہ کا نام بلند کرنے اور اس کی راہ میں جان و مال کی قربانیوں کا نام 'وہابیت'، ہے تو ہم وہابی ہیں۔ چلیئے! چھٹی ہوئی ـــــ

کتاب کے آغاز میں وہابیت پر چند صفحے اسی 'عذر'، کے ماتحت لکھے گئے ہیں، جو شاید اصحابِ نظر کی نگاہ میں قابلِ قبول نہ ہوں۔

ـــــــ (۳) ـــــــ

:: پچھلے چند برسوں میں جن صاحبوں نے سید شہیدؒ اور اُن کے ماننے والوں پر کچھ لکھا ہے، ان میں مولانا علیہ اللہ سندھی مرحوم و مغفور (ف ۱۳۶۳ھ) اور مولانا ابوالحسن علی ندوی قابلِ ذکر ہیں۔ مولوی طفیل احمد صاحب (حاشیہ اگلے صفحہ پر)

مصنف (مسلمانوں کا روشن مستقبل) نے بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ مگر ان کا زیادہ تر اعتماد مجاہدینِ ہند کے خاص کرم فرما ڈاکٹر ولیم ولسن ہنٹر پر رہا ہے۔ مولانا سندھیؒ کی کتاب "شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک" وسیع مطالعہ اور عمیق فکر کا نتیجہ ہے۔ مگر (اللہ ان کو کروٹ کروٹ جنّت نصیب کرے اور ان کی لغزشوں سے درگذر فرمائے) انھوں نے حزبِ ولی اللہ کی تشکیل اور من مانی توجیہ کی خاطر سید صاحبؒ کے ماننے والوں اور خاص کر اہلِ صادق پور پر بڑا ظلم کیا ہے۔ اور ان کی کمزوریوں کی تنقید و مذمت میں ان کا قلم اعتدال پر قائم نہیں رہ سکا ہے۔ راقم نے ان کی زندگی ہی میں اس کتاب پر تنقید کی تھی اور اہلِ صادق پور کے صحیح حالات پیش کئے تھے۔ (ملاحظہ ہو:۔ مولانا سندھی اور ان کے افکار و خیالات پر ایک نظر)

مولانا ابوالحسن علی ندوی کی کتاب (سیرت سید احمد شہیدؒ) سید صاحب کی سوانح، ان کی تعلیمات، اور مشن پر بے مثل کتاب ہے اور اب تک اس موضوع پر جو کچھ کہا گیا ہے، سب پر بھاری ہے۔ مگر افسوس کہ میرے عزیز ترین دوست اور مخلص بھائی کا طریقِ نظر و فکر خالص عقیدت مندانہ ہے اور انھوں نے بزرگوں کی کوتاہیوں اور فروگذاشتوں سے نگاہ بچا کر نکل جانے کی کوشش کی ہے۔

راقم کی روش ان دونوں اصحابِ علم و فضل کے مقابلے میں بَین بَین کی سی رہی ہے۔ یہ گنہگار سید صاحبؒ کی تحریکِ تجدید و جہاد کو ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک سمجھتا ہے۔ اور مولانا سندھیؒ کی طرح ان کی دعوت کو کسی اندرونی یا بیرونی تحریک کا ضمیمہ نہیں خیال کرتا اور نہ انہیں کسی امیرِ جماعت کا لفٹننٹ یا کمانڈر انچیف تصور کرتا ہے ــــ دوسری طرف جیسا کہ زیرِ نظر صفحات کے مطالعے سے واضح ہوگا، سید صاحب

---

[۱] افسوس کہ ان سطروں کے چھپنے کے بعد مولوی سید طفیل احمد صاحب نے بھی دارِ آخرت کی راہ اختیار کر لی۔ (۱۳۶۵ھ) ــــ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔

یا ان کے اصحابِ خاص کو معصوم بھی نہیں سمجھتا۔ نیز مستقبل میں ماضی کی غلطیوں سے بچنے کے لئے پچھلی فروگذاشتوں کی نشاندہی ضروری خیال کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ طریقِ فکر بہت کم لوگوں کو خوش کر سکے گا۔ اور بہت ممکن ہے کہ اس کی مخالفت میں آوازیں بھی بلند ہوں۔ "اِن خطرات" کو محسوس کرتے ہوئے بھی اس گنہگار نے جابجا جائز اور بے لاگ تنقید کرنے کی جرأت کی ہے اور یہ صرف اس خیال کے ماتحت کہ حق بات کڑوی معلوم ہوتی ہے اور اگر کوئی پائیدار لٹریچر اور صالح فضا تیار کرنا ہے، تو پھر پسندِ عام کی خاطر حق کے اظہار میں تامل نہ ہونا چاہیئے۔ نیتوں کا حال اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

آخر میں ایک حرف مآخذ سے متعلق بھی عرض کردوں۔ راقم کی یہ کوشش رہی ہے کہ زیادہ سے زیادہ معاصر شہادتوں اور اصلی (ORIGINAL) مآخذ سے کام لیا جائے۔ کتاب شروع کرنے سے پہلے آخری باب 'کتابیات' (BIBLIOGRAPHY) پر نظر ڈالی جائے تو بین السطور تنقیدوں کے سمجھنے میں آسانی ہوگی۔

اس کتاب یا کتابچے کی تیاری میں جن قیمتی کتابوں، رپورٹوں، سرکاری دستاویزوں اور قلمی ذخائر سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملا ہے۔ ان تک اس بے برگ و بے نوا طالبِ علم کی رسائی مشکل تھی، اگر بزرگوں، دوستوں، اور عزیزوں کی عنایت اور معاونت نہ ہوتی۔ بڑی مشکل یہ ہے کہ جن 'بزرگ' نے قیمتی کاغذات کی فراہمی میں سب سے زیادہ مدد دی ہے، انھوں نے اصرار کے باوجود نام ظاہر کرنے کی اجازت نہیں دی۔ بہرحال یہ حقیر ان تمام اہلِ علم کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہے اور توقع رکھتا ہے کہ یہ عنایتیں جاری رہیں گی۔ نیز اہلِ علم و اربابِ نظر حضرات سے درخواست ہے کہ وہ حقیر کی کوتاہیوں اور لغزشوں پر متنبہ کرنے میں مطلق تامل نہ فرمائیں۔

یہ ہیچ مچ رقم اپنی طالبِ علمانہ حیثیت اور کم علمی سے خوب واقف ہے۔ ہر مفید مشورہ شکریہ کے ساتھ قبول کیا جائے گا اور تو اور معاندانہ تنقیدوں سے بھی کام کی بات مل سکی تو اظہارِ امتنان کے ساتھ اخذ کی جائے گی۔

مخدومی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی راقم کے اور اس کتاب کے تمام ناظرین کے شکریہ کے مستحق ہیں کہ انھوں نے ازراہِ عنایت مسودہ پر نظر ڈالنے کی زحمت گوارہ کی اور مفید مشوروں سے سرفراز کیا۔ نیز برادر عزیز جناب طفیل محمد صاحب قیّم جماعتِ اسلامی کا شکریہ ادا کرنا ضروری ہے کہ انھوں نے قانونی اصطلاحات کی توضیح اور تفہیم میں راقم کی مدد کی۔

پہلا باب

وہابیت کیا ہے؟

'وہابیت' کی نسبت عام طور پر شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب بن سلیمان نجدی کی طرف کی جاتی ہے۔ شیخ کی ولادت ۱۱۱۵ھ ۱۷۰۳ء میں ہوئی۔ ان کی نشوونما اور تربیت صحرائے عرب ہی میں ہوئی۔ تحصیلِ علم کے لئے مدینہ منورہ اور بصرہ تک کے سفر کئے۔ ان کی ولادت کے وقت یعنی بارہویں صدی ہجری کے آغاز میں مسلمانوں کی حالت ناگفتہ بہ ہو رہی تھی۔ دین کے ہر شعبہ میں نجد و عرب کے کلمہ گو انحطاط پذیر تھے۔ اور ایک نجد و عرب ہی پر کیا موقوف ہے، ساری اسلامی دنیا شرک و بدعات کے دلدل میں پھنسی ہوئی تھی۔ کوئی سیاسی شعور باقی نہیں رہا تھا۔ جہاں کچھ طاقت تھی وہاں 'ملوکیت' کا دور دورہ تھا۔ یہ حالات دیکھ کر محمد بن عبدالوہابؒ کے دل میں تڑپ پیدا ہوئی۔ بالکل نوجوانی ہی میں اصلاح و تجدید کی دعوت دینا شروع کی۔ اپنے گردونواح کے مسلمانوں کو کتاب و سنت کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا اور اس سلسلے میں ہر طرح کی اذیتیں برداشت کیں، تکلیفیں سہیں۔ پہلے بوڑھے باپ ہی کی خفگی برداشت کرنا پڑی۔ پھر اپنے آبائی وطن عُیینہ سے نکلنے پر مجبور کئے گئے۔ آخر چند برسوں کے ابتلاء کے بعد دَرعیہ (نجد) کے امیر محمد بن سعودؒ (ف ۱۱۷۹ھ۔ ۱۷۶۵ء) کے ہاں پناہ ملی۔ امیر اور اس کے عزیز دعوتِ توحید کے سرگرم حامی بن گئے اور ان کی مدد اور معاونت کے بل پر شیخ الاسلام نے تبلیغ اور زوروں پر شروع کر دی تا آنکہ کامیابی ان کے قدم لینے لگی۔ شمع توحید کے پروانے اطراف و اکناف سے آ آ کر شیخ الاسلام کے حلقۂ درس میں حاضر ہوتے اور پھر لوٹ کر اپنے اپنے علاقوں میں اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچاتے۔

محمد بن سعود کی وفات ۱۱۷۹ھ، ۱۷۶۵ء میں ہوئی اور اس کا بیٹا عبدالعزیز بن محمد بن سعود تاج و تخت کا مالک ہوا۔ عزم و ہمت میں یہ اپنے باپ سے کسی طرح کم نہیں، بلکہ بڑھا چڑھا ہوا تھا۔ اور اس کے زمانۂ حکومت میں "دعوت" کی توسیع اور تبلیغ میں بڑی ترقی ہوئی۔ خود شیخ الاسلام بنفسِ نفیس عام تبلیغی کاموں کی دیکھ بھال کرتے۔ امیر عبدالعزیز صرف ایک مطیع شاگرد کی طرح ان کے احکام اور ہدایتوں کی تعمیل کرتا۔ شیخ نے ۱۲۰۶ھ، ۱۷۹۲ء میں بانوے سال کی عمر پاکر وفات پائی۔ ان کے بعد ان کے بیٹے اور پوتے تبلیغ و دعوت کا فریضہ سرگرمی کے ساتھ ادا کرتے۔ دوسری طرف امیر عبدالعزیز برابر اپنا دائرۂ حکومت وسیع کرتا رہا، تاآنکہ نجد کا علاقہ پورا اس کے زیرِ نگیں ہوگیا۔ حجاز پر بھی چڑھائی کی۔ اور مکہ معظمہ پر اس کا عارضی قبضہ بھی ہوگیا۔ پھر ترکوں نے دوبارہ قبضہ کرلیا امیر عبدالعزیز درعیہ کی جامع مسجد میں نماز پڑھاتے ہوئے ایک ایرانی شیعہ کے ہاتھوں شہید ہوا (۱۲۱۸ھ، ۱۸۰۳ء) اور اسی سال اس کا بیٹا سعود بن عبدالعزیز بن محمد، مکہ معظمہ میں فاتحانہ داخل ہوا اور حرم کو شرک و بدعت کی آلودگیوں سے پاک کرنے میں کامیاب ہوا۔ اس کے بعد اہلِ نجد کے حوصلے بڑھ گئے۔ ان کی نگاہیں شام کی طرف اُٹھنے لگیں اور تمام دنیائے اسلام کو دعوتِ توحید سے آشنا کرنے کا خیال ان کے دلوں میں گدگدی پیدا کرنے لگا۔ ان کی دینی غیرت اور قومی شجاعت کامیابی کی ضمانت تھی۔ شام اور عراق کے علاقوں پر کئی کامیاب حملے بھی کئے، لیکن خلافت کے علمبردار قسطنطنیہ کے عرش نشین ترک، عربوں کی اس بڑھتی ہوئی طاقت کو دیکھنا کب گوارہ کرسکتے تھے؟ انھوں نے مقابلہ سے خود تنگ آکر محمد علی پاشا، خدیوِ مصر سے امداد طلب کی۔ ترک (ترکی مرکزی حکومت۔ آستانہ) محمد علی پاشا کے بڑھتے ہوئے اقتدار سے الگ خائف تھے۔ انھوں نے "سانپ مرے اور لاٹھی نہ ٹوٹے" پر عمل کرتے ہوئے محمد علی کو نجدیوں کی سرکوبی پر مامور کیا۔ چند سالوں کی مسلسل خونریز جنگوں کے بعد نجدیوں کو شکست ہوئی۔

سعود بن عبدالعزیز کی وفات ۱۲۲۹ھ، ۱۸۱۴ء میں ہوئی۔ اس کا بیٹا عبداللہ بن سعود بن عبدالعزیز گو اپنے باپ سے بہادری میں بڑھ چڑھ کر تھا، مگر تدبّر میں اسے اپنے

اولوالعزم باپ سے کوئی نسبت نہیں تھی۔ سعود کی وصیت تھی مصریوں سے کھلے میدان میں ہرگز مقابلہ نہ کیا جائے، مگر عبداللہ اپنی مردانگی اور شجاعت کے زعم میں یہ نصیحت نظر انداز کر گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نجد کے بادیہ نشین جدید یورپی اسلحہ اور آلاتِ جنگ کی تاب نہ لا سکے۔ آخر ۱۲۳۳ھ، ۱۸۱۸ء میں عبداللہ بن سعود نے سپر ڈال دی۔

محمد علی مصری نے اسے آستانہ بھیج دیا، جہاں وہ بے رحمی کے ساتھ قتل کر دیا گیا۔ ادھر محمد علی کے بیٹے ابراہیم پاشا فاتح درعیہ نے نجدی پایۂ تخت کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ بوڑھوں، بچوں تک کو نہیں چھوڑا گیا۔ مہینوں تک مصری فوج لوٹ مار کرتی رہی۔ مغربی فوجیں فتح پانے کے بعد جو کچھ کرتی ہوں گی، مصری فوج نے اس سے کچھ زیادہ ہی کیا۔ یہ تھی تیرھویں صدی ہجری کے آغاز میں مصری اور ترکی مسلمانوں کی حالت اور اُن کا نظریۂ حکومت ___ اہلِ نجد کی تاریخی سرگذشت طویل اور دلچسپ بھی ہے۔ خاص کر ان کی نشاۂ ثانیہ کی تاریخ حد درجہ حیرت انگیز ہے۔ لیکن ہمارا مقصود نجد کی تاریخ بیان کرنا نہیں۔ اس موقع پر راقم نے صرف ان کی ابتدائی تاریخ کا اجمالی خاکہ پیش کر دیا ہے تاکہ آئندہ اس مضمون کے سمجھنے میں آسانی ہو، اور ہندوستان کے بدنام 'وہابی' مجاہدین کے حالات پڑھتے وقت، نجد کے مظلوم اور موحد حنبلی "وہابیوں" کی تاریخ بھی پیشِ نظر رہے۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو:۔ راقم کی کتاب (محمد بن عبدالوہاب: ایک مظلوم اور بدنام مصلح) جس کا ذکر دیباچہ میں آچکا ہے۔

دوسرا باب

بدنام وہابی

نجدیوں کا یہ اُٹھان ترکوں اور انگریزوں کی نگاہوں میں بری طرح کھٹکنے لگا۔ ترکوں کو اس لیۓ کہ اُن کے "حرمین شریفین" کی "خادمیت" پر حرف آتا تھا، اور انگریزوں کو اس لیۓ کہ نجدی بحری طاقت نے خلیج فارس میں انکے چھکے چھڑا دیۓ تھے۔ یہ ایک دلچسپ تاریخی حقیقت ہے کہ درعیہ کی فتح (۱۲۳۳ھ، ۱۸۱۸ء) پر ابراہیم بن محمد علی مصری کو مبارکباد دینے کے لیۓ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنا خاص قاصد[1] بھیجا تھا۔ دوسری طرف محمد علی کی فوج میں متعدد فرانسیسی اور اطالوی افسر اور ڈاکٹر تھے۔ وسط عرب میں ترقی اور تجدید کی لہران سب کے گلوں کی پھانس بن گئی اور وہ ان کے خلاف اپنے مقبوضات میں پروپیگنڈا کرنے لگے۔ ترکوں نے مولویوں اور پیروں کی مدد حاصل کی۔ محمد عبد الوہابؒ کی طرف نسبت کریں تو قاعدہ سے "محمدی" کہیں گے، جیسا کہ ابھی عرض کیا جا چکا ہے، مگر "محمدی" کا لقب تو بدنام کرنے کے لیۓ کافی نہیں تھا۔ اس لیۓ شیخ الاسلام کے والد عبد الوہاب کی طرف نسبت کر کے "وہابیت" کا لقب ایک مذہبی گالی کے طور پر ایجاد کیا گیا۔

ترکوں اور انگریزوں کا یہ پروپیگنڈا خالص سیاسی حیثیت رکھتا تھا، مگر انھوں نے اسے مذہبی رنگ دینا شروع کیا تاکہ مشائخ اور خوش عقیدہ مسلمانوں کو آسانی کے ساتھ مشتعل کیا جا سکے۔ مولویوں اور پیروں کی خدمات سے فائدہ اٹھایا گیا۔ مکہ معظمہ کے شیخ احمد زینی دحلان (ف ۱۳۰۴ھ) اور بدایوں کے مولوی فضلِ رسول (ف ۱۲۹۷ھ)

---

[1] محمد بن عبد الوہاب۔ ایک مظلوم اور بدنام مصلح۔

اور ان کے پیروؤں کی کوششوں سے افترا پردازیوں اور بہتان طرازیوں کا ایک انبار لگ گیا، جس سے کم و بیش آج تک جاہل اور عوام متاثر ہیں۔ مگر اہلِ علم میں اب یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں رہی ہے۔ ساحرانِ فرنگ کی عشوہ طرازیوں کا اتنا تجربہ ہو چکا ہے کہ اب یہ تاریخی حقیقتیں خود بخود نمایاں ہونے لگی ہیں اور پروپیگنڈوں کا تاریک نقاب تار تار ہو رہا ہے۔

ہندوستان کی اس پہلی اسلامی تحریک اور نجد کی دعوتِ توحید و اصلاح کا فرق

یہ اسی پروپیگنڈے کا اثر تھا کہ ہندوستان میں حضرت سید احمد شہیدؒ بریلوی (۱۲۰۱ھ-۱۲۴۶ھ) اور مولانا اسمٰعیل شہیدؒ دہلوی (۱۱۹۶ھ-۱۲۴۶ھ) کے ماننے والوں اور نقشِ قدم پر چلنے والوں کو بھی 'وہابی' کے لقب سے یاد کیا گیا۔ حالانکہ انھیں نجد کے موحدین سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اصل سرچشمہ (کتاب و سنت) کی وحدت کے باعث دونوں تحریکوں کے درمیان بہت کچھ مماثلت پائی جاتی ہے۔ 'توحید' پر دونوں تحریکوں میں خاص طور پر زور دیا گیا ہے۔ شیخ الاسلام کی کتاب 'التوحید' اور مولانا شہیدؒ کی 'تقویۃ الایمان' بہت کچھ ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہیں۔ پھر بھی غور سے دونوں تحریکوں کا مطالعہ کیا جائے تو بعض اہم اور بنیادی مسئلوں میں بھی اختلاف رائے کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔ طریقِ کار کا فرق تو قدم قدم پر ظاہر ہوتا ہے۔[1] لیکن پروپیگنڈے اور سیاسی دسیسہ کاریوں کا برا ہو، اسلامی ہند کی اس پہلی تحریکِ تجدید و جہاد کو بھی 'وہابیت' کا نام دے کر بری طرح بدنام کیا گیا۔[2] اور انگریز مصنفوں اور ان کی دیکھا دیکھی اپنوں نے

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو:۔ مولانا عبید اللہ سندھی کی (شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک (ص ۱۳۶-۱۲۹) اور راقم کی "مولانا سندھی کے افکار و خیالات پر ایک نظر (ص ۱۱۶-۱۰۲)

[2] اصل میں ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک پر وہابیت کا اطلاق صرف اس لئے کیا گیا کہ وہابیت کی اصطلاح پہلے گالی کے طور پر کافی مشتہر ہو چکی تھی۔ اب ایک نئی اصطلاح ایجاد کرنے اور چلانے کی زحمت کیوں اٹھائی جاتی۔

بھی اس نام کو اتنی شہرت دی کہ آج حضرت سید احمد شہیدؒ کے پیرو اور ماننے والے اسی بد نام لقب (وہابیت) سے یاد کیے جاتے ہیں۔ اور راقم کو خود اس تحریر کے آغاز میں 'وہابیت' کی حقیقت بیان کرنا پڑی۔ لیکن کوئی غلط بات، صرف شہرت اور پروپیگنڈے سے حقیقت نہیں بن سکتی۔ دجل اور فریب کا پردہ ایک نہ ایک دن چاک ہو کر رہتا ہے۔ آیئے ہم آپ کو داخلی اور خارجی شہادتوں کی روشنی میں دکھائیں کہ حضرت سید احمد شہیدؒ کی "دعوتِ تجدید وجہاد" نجد کی تحریک "توحید واصلاح" سے بالکل متاثر نہیں ہوئی۔

یہ ایک واقعہ ہے کہ حضرت سید احمد شہیدؒ (مولود ۱۲۰۱ھ) کو کم عمری ہی سے تجدیدؒ احیائے سنت کی فکر دامن گیر تھی۔ اور ان کی دعوت میں ترکِ بدعات کی نسبت جہاد فی سبیل اللہ پر زور تھا۔

اس کے برعکس شیخ الاسلام محمد بن عبد الوہابؒ کی دعوت میں توحید اور ترکِ بدعات کو زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ شیخ الاسلام کی کتاب 'التوحید' میں "جہاد" پر کوئی خاص باب یا فصل نہیں۔ دوسری طرف سید شہیدؒ کا کوئی مکتوب 'جہاد' کے ذکر سے خالی نہیں ملتا۔ غالباً یہ دونوں ملکوں کے طبعی اور مقامی حالات کا نتیجہ تھا۔ نجد اور اس کے اِرد گِرد مسلمانوں ہی جیسا نام رکھنے والے، بدعات اور شرک کی آلودگیوں میں مبتلا تھے۔ ہندوستان میں اپنوں کی خرابی کے ساتھ ساتھ سات سمندر پار سے آئی ہوئی ایک قوم زمامِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے رہی تھی۔ مزید برآں ایک ہمسایہ لیکن نیم وحشی مذہبی گروہ پنجاب و سرحد کے غریب مسلمانوں کے لئے مستقل فتنہ بنا ہوا تھا۔ اس لئے سید شہیدؒ کے خلفاء اور مریدوں کا سارا جوشِ عمل جہاد و قتال ہی کی طرف مائل تھا اور اُنکے نقشِ قدم پر چلنے والے اس راہ میں ہمیشہ سر بکف رہے اور آج بھی ان کا ایک گروہ حُسنِ نیت کے ساتھ (خواہ غلط ہی سہی) آیت ربّانی:

وَمِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ	ان مومنین میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ انھوں نے جس بات کا اللہ سے عہد کیا تھا اس میں سچّے اُترے پھر بعضے تو ان میں وہ ہیں جو اپنی نذر پوری کر چکے ہیں۔

مَنْ يَّنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا۔ اور بعضے ان میں مشتاق ہیں اور انھوں نے (الاحزاب : ۲۳) ذرا تغیر و تبدل نہیں کیا۔

کی یاد تازہ کر رہا ہے۔

سید شہیدؒ کا ظہور اس وقت ہوا جب نجدیوں کی دعوت نجد اور اس کے اطراف میں محدود تھی۔ اور حجاز پر قبضے سے پیشتر (۱۲۱۸ھ، ۱۸۰۳ء) دنیائے اسلام میں انہیں کوئی نہیں جانتا تھا۔ محمد علی مصری نے ۱۲۲۷ھ، ۱۸۱۲ء میں انہیں حرمین سے بے دخل کیا۔ اس طرح پر حرمین پر ان کا قبضہ نو سال سے زیادہ نہیں رہا اور یہ زمانہ بھی یکسر جنگ و جدال میں بسر ہوا۔ حضرت سید شہیدؒ اور ان کے رفقا ۱۲۳۷ھ میں حج بیت اللہ سے فارغ ہوئے، جبکہ مکہ مکرمہ میں نجدیوں کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ بلکہ مکہ مکرمہ کے حکام حاجیوں کو اہلِ نجد سے ادنیٰ تعلق کے شبہ پر بھی تنگ کیا کرتے تھے۔ پھر "نجدی وہابیوں" سے سید صاحبؒ کے ملنے اور متاثر ہونے کا واقعہ افسانہ نہیں تو اور کیا ہے؟ نیز یہ بھی پیشِ نظر رہے کہ سید صاحبؒ حج سے پیشتر ہی سکھوں سے جہاد کا عزم کر چکے تھے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ سید شہیدؒ کی دینی تحریک، تجدید و احیائے دین کی ایک مستقل تحریک تھی۔ مشیتِ الٰہی یہ ہوئی کہ تجدیدِ امت کا سہرا ان کے سر رکھا جائے۔ توفیقِ باری سے انہیں رفیق اور جاں نثار بھی ایسے میسر آئے کہ صحابۂ کرامؓ کے بعد "اتنے نفوسِ قدسیہ کا ایک جا ہونا" تاریخ کے صفحات میں نظر نہیں آتا۔ نجد کی دعوتِ توحید سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ انگریز مصنفوں میں ولیم ولسن ہنٹر (W. W. HUNTER) نے حضرت سید شہیدؒ اور ان کی جماعت پر ناروا اور رکیک حملے کیے ہیں اور اُن کے پیروؤں کی "باغیانہ" سرگرمیوں پر اس نے بہت تفصیل سے خامہ فرسائی کی ہے۔ یہ اسی کے دماغ کی اُپج ہے کہ سید شہیدؒ نجد کے وہابیوں سے متاثر تھے اور اسی کی تقلید میں اپنوں اور غیروں نے بھی اس غلط بیانی[۱] کا بار بار اعادہ کیا ہے۔ اس مختصر سی تحریر میں ہنٹر کی غلط بیانیوں پر

---

[۱] ہمیں اہلِ نجد اور ان کی دعوتِ توحید و اصلاحِ امت سے کوئی اختلاف یا بیر نہیں۔ ہمارا عمل کتابی

تفصیل سے گفتگو نہیں کی جا سکتی۔ یہاں ہمیں صرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ مجاہدین کا یہ سفید فام دشمن اپنی انتہائی کوششوں کے باوجود اس سلسلے میں جو کچھ لکھ سکا ہے۔ اس سے بھی سید صاحبؒ کا نجدیوں سے ملنا ثابت نہیں ہوتا۔ ہنٹر صاحب فرماتے ہیں :۔

"قیام مکہ کے زمانہ میں حکام کی توجہ ان کی طرف مبذول ہوئی۔ اس لئے کہ ان کی دعوت ان بدوؤں (محمد بن عبدالوہاب کے ماننے والوں) سے ملتی جلتی تھی جنہوں نے گذشتہ سالوں میں مقامات مقدسہ کو بہت گزند پہنچایا تھا۔ مجاوروں نے انکے ساتھ حقارت کا برتاؤ کیا اور حرم سے نکال دیا۔"[1]

گو یہ "حقارت کا برتاؤ" اور "حرم سے نکالنے کا واقعہ" یکسر ہنٹر کے دماغ کی پیداوار ہے پھر بھی ہم یہاں اسے نظر انداز کرتے ہوئے اہلِ نظر و ارباب انصاف سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ سید شہید (ش ۱۲۴۶ھ، ۱۸۳۱ء) شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہابؒ (ف ۱۲۰۶ھ، ۱۷۹۲ء) کی تعلیمات سے متاثر ہوئے تھے، ورنہ ہمارے پاس اس بات کا کافی ثبوت موجود ہے کہ مکہ مکرمہ کے حکام و امرار نے سید شہیدؒ کی پوری خاطر مدارات کی اور انھیں سر آنکھوں پر بٹھایا۔

خود ہنٹر اسی کتاب میں دوسری[2] جگہ لکھتا ہے :۔

"کسی وہابی کے لئے ممکن نہ تھا کہ جان جوکھوں میں ڈالے بغیر مکہ (مکرمہ) کی سڑکوں پر چل سکے۔ یہ حال ۱۸۱۳ء سے ۱۸۳۰ء تک رہا۔"

اور ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ حضرت سید صاحبؒ اور ان کے رفقاء ۱۲۳۷ھ، ۱۸۲۲ء میں حج بیت اللہ سے شرف یاب ہوئے۔ پھر یہ کیسے ممکن ہوا کہ بدنام وہابی

سنت پر ہے، ہم نہ سید شہیدؒ کے مقلد ہیں نہ محمد بن عبدالوہابؒ نجدی کے۔ یہاں صرف غیروں اور اپنوں کی اس پھیلائی ہوئی غلط بیانی کا ازالہ مقصود ہے کہ "سید صاحبؒ کی دعوتِ تجدید و جہاد نجد کی تحریک توحید سے متاثر تھی"۔ یہ بحث خالص علمی اور تحقیقی ہے۔ حربِ عقائد یا سیاسی پروپیگنڈے سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

[1] THE INDIAN MUSALMANS طبع جدید۔ ص ۵۲

[2] THE INDIAN MUSALMANS طبع جدید۔ ص ۱۰۰

مبلغوں سے ان کی ملاقاتیں ہوئیں اور وہ ان کی تعلیم سے متاثر ہوئے۔ اصل یہ ہے کہ دنیائے اسلام کے عام انحطاط اور پستی کے عالم میں نجدی بدوؤں کا اٹھان اور ان کی "شمشیر زنی" یورپی سیاست کاروں اور "اسلامی خدمت" کے ترکی اجارہ داروں کو ایک آنکھ نہیں بھائی اور انھوں نے "نجدیوں" کو "وہابی" کا نام دے کر بدنام کرنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ دنیائے اسلام کی ہر مفید تحریک پر وہابیت کا لیبل لگانا معاندین اسلام کا عام شعار ہو گیا۔

انسائیکلو پیڈیا آف اسلام میں مضمون 'وہابیت' کا لکھنے والا مشہور دشمنِ اسلام اور شاتم رسول صلی اللہ علیہ وسلم مارگولیوتھ عجیب و غریب حماقتوں کا مرتکب ہوا ہے۔ مولانا شہیدؒ کو سید صاحبؒ کا بھانجا یا بھتیجا اور صراط مستقیم کو وہابیۂ ہند کا قرآن[1] کہتا ہے۔

اس کا مقالہ 'وہابیت' WAHABIYAH (مندرجہ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام) تاریخی و تصنیفی اغلاط کا مضحکہ انگیز مرقع ہے۔ لیکن اسی انسائیکلو پیڈیا میں ابن سعود اور (سید) احمد کے مقالے اچھے اور عالمانہ ہیں۔ ہمیں یہاں احمد والے مقالے سے بحث ہے۔ اس کا لکھنے والا ایک حد تک سید شہیدؒ اور محمد بن عبد الوہابؒ کی تحریکوں کو سمجھا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کا فرق اس کی نگاہ میں ہے۔ لکھتا ہے:-

> "کچھ دنوں تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ (سید صاحب) وعظ و ارشاد کے لئے دورہ کرنے لگے۔ ان کے خیالات ایک حد تک عرب وہابیوں سے ملتے جلتے ہیں۔ سادہ عبادت، بدعات سے اجتناب، خرافات پر عقیدت سے بُعد اور انبیاء کی تعظیم میں حد سے زیادہ غلو سے پرہیز ـــــ ان امور میں ان کے اور نجدی وہابیوں کے درمیان مماثلت ہے۔
>
> ۱۲۲۶ھ میں سید احمد شہید حج کے لئے مکہ روانہ ہوئے اور جب دو سال کے بعد ہندوستان واپس ہوئے تو پنجاب کے مسلمانوں کو جور و ظلم سے نجات دلانے کی تیاریاں کرنے لگے۔"

---

[1] انسائیکلو پیڈیا آف اسلام: مقالہ BLUMHART

اس میں شک نہیں کہ دونوں تحریکوں کے درمیان ایک حد تک مشارکت اور مماثلت پائی جاتی ہے اور اصل سرچشمہ میں اتحاد کے باعث ایسا ہونا ناگزیر تھا۔ کتاب و سنت سے براہ راست اکتساب فیض کرنے والی جماعتیں جہاں بھی کام کریں گی، ان کا طریقِ کار اور دعوت کی بنیادی فکر ملتی جلتی ہوگی۔ لیکن اس "مماثلت و مشارکت" کی بنیاد پر جھوٹی تاریخ نہیں بنائی جا سکتی۔ اور یہ واقعہ اپنی جگہ ثابت ہے اور متحقق ہے کہ سید صاحبؒ نجد کی تحریکِ توحید سے بالکل متاثر نہیں ہوئے اور نہ کسی نجدی عالم اور داعی سے ان کا ملنا ثابت ہے۔

وہابی اور اہلِ حدیث

اسی سلسلے میں ایک اور غلط فہمی کا ازالہ مناسب ہوگا۔۔۔ ہندوستان میں حضرت سید صاحبؒ کی دعوتِ تجدید و جہاد کے ساتھ ساتھ اتباعِ سنت اور عمل بالحدیث کا چرچا بھی شروع ہوا۔ خود سید صاحبؒ اور اُن کے خاص ماننے والے یعنی اہلِ صادق پور تو اپنے کو "حنفی مع القول بالترجیح" کہتے تھے مگر خود سید احمد صاحبؒ کی جماعت میں مولانا اسماعیل شہیدؒ (ش ۱۲۴۶ھ) کے اثر سے خالص "عاملین بالحدیث" کا بھی ایک طبقہ پیدا ہوگیا تھا۔ شروع شروع یہ دونوں طبقے یعنی حنفی اور اہلِ حدیث ساتھ مل کر کام کرتے رہے۔ دونوں کا زور جہاد پر تھا اور ان فروعی مسئلوں میں وہ روادار تھے۔ مگر آگے چل کر جب مجاہدین کی داروگیر شروع ہوئی اور ہر آمین بالجہر کہنے والے پر "وہابی" کا شبہ کیا گیا اور "وہابی" کے معنی سرکاری زبان میں "باغی" کے ہو گئے (جیسا کہ آئندہ صفحات میں آتا ہے) تو ہندوستان کی جماعت اہلِ حدیث موجودہ شکل میں نمایاں ہوئی اور ان کے سرگروہ مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی (۱۲۵۶ھ – ۱۳۳۸ھ) نے سرکارِ انگریزی کی اطاعت کو واجب[1] قرار دیا اور حد یہ کہ وقت کے بعض

---

[1] مولوی محمد حسین بٹالوی (ف ۱۳۳۸ھ) نے جہاد کی منسوخی پر ایک رسالہ (الاقتصاد فی مسائل الجہاد) فارسی زبان میں تصنیف فرمایا تھا اور مختلف زبانوں میں اس کے ترجمے بھی شائع کرائے تھے۔ معتبر اور ثقہ راویوں کا بیان ہے کہ اس کے معاوضے میں سرکارِ انگریزی سے انہیں "جاگیر" بھی ملی تھی۔۔۔ اس رسالہ کا پہلا حصہ ہمارے

مشہور حنفی علماء[1] کو سرکار سے بغاوت کے طعنے دیئے[2]۔ ان بیچارے کو یہ ہوش نہیں رہا کہ وہ اپنے کو سرکار کی زد سے بچانے کی فکر میں کیا کر رہے ہیں اور اپنے ماننے والوں کو کس پستی کی طرف لے جا رہے ہیں؟ مولوی محمد حسین صاحب اور ان ہی جیسے بعض علماء اہلِ حدیث کی روش کا یہ نتیجہ ہوا کہ موجودہ جماعتِ اہلِ حدیث کا عام رجحان فروعی مسئلوں تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ پوری جماعت "اہلِ حدیث" ایسی ہی ہے۔ حاشا و کلا! ان ہی میں اہل صادق پور بھی ہیں جو سید صاحبؒ کے عشق و محبت میں خود ان کے اہلِ خاندان سے بھی بڑھ چڑھ کر ہیں۔ نیز ہندوستان کے طول و عرض میں سینکڑوں اہلِ حدیث ایسے ملیں گے جن کے دل اب بھی جذبۂ جہاد سے معمور ہیں اور وہ اپنے اسلاف کی روش پر سختی کے ساتھ قائم ہیں۔ اس کے علاوہ سید صاحبؒ کے ماننے والے اور ان کے مسلک کے مطابق جہاد و اصلاح کا ولولہ رکھنے والے اہلِ حدیث طبقہ کے اندر محدود نہیں۔ اہلِ دیوبند (جو پکے حنفی ہیں) کا ایک اچھا خاصا طبقہ سید شہیدؒ کے مسلک پر چلنا اپنے لئے سرمایۂ سعادت سمجھتا ہے۔ اہلِ دیوبند اور جماعت اہلِ حدیث کے علاوہ بھی سمجھدار مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد سید صاحبؒ اور مولانا شہیدؒ کے مشرب و مسلک کو عین اسلام تصور کرتی ہے۔ یہ تمام طبقے عرفِ عام کے مطابق "وہابی" کی فہرست میں آتے ہیں مگر انہیں اہلِ حدیث نہیں کہا جا سکتا۔ اہلِ حدیث ایک بالکل دوسری جماعت ہے جو باطنیوں اور شیعوں کے توڑ کے لئے پیدا ہوئی تھی۔ اور یہ کوئی نئی جماعت نہیں۔

بپیشِ نظر ہے۔ پوری کتاب تحریف و تدلیس کا عجیب و غریب نمونہ ہے۔ نمونہ کے لئے مندرجہ ذیل اقتباس کافی ہوگا۔

نتیجہ مسئلہ اولیٰ:۔ ازیں مسئلہ ثابت و متحقق شد کہ کمال اسلام و ایمان و نجات اہل اسلام بر جہاد موقوف و منحرف نیست۔ اگر مسلمانان نارا از فرائضِ دینی بازندارند مجرد عبادت برائے نجات و کمال ایمان کافی است۔ پس آنکہ الخ (ص ۸)

[1] مولانا فضل حق خیر آبادی (اسیر انڈمان: ف ۱۲۷۸ھ) اور حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکہ (ف ۱۳۱۷ھ) وغیرہم۔

[2] رسالہ اشاعت السنۃ۔

بنوعباس کے اوائل عہد (دوسری صدی ہجری) ہی میں محدثین اور اہلِ حدیث کا گروہ ممتاز و مشہور تھا۔ یہ اور بات ہے کہ موجودہ جماعت اہلِ حدیث آمین و رفع یدین اور اس قسم کے دوچار فروعی مسئلوں پر قانع ہو کر رہ گئی ہے۔ بلکہ اب اس کی حیثیت 'جماعت' سے زیادہ 'فرقہ' کی ہو گئی ہے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ ہندوستان کے اصلاحی 'وہابی' اور ہیں اور 'اہلِ حدیث' اور۔ اور راقم[1] ان دونوں لفظوں کے استعمال میں اس فرق کو ملحوظ رکھتا ہے۔ گو سچ پوچھیے تو لفظ 'وہابی' کا اطلاق کسی گروہ پر صحیح نہیں۔

---

[1] راقم کو اگر کوئی طنز سے 'وہابی' کہتا ہے تو تردید کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ لیکن اگر کوئی 'اہلِ حدیث' کے نام سے یاد کرے، تو اس سے برأت کرنا اپنا فرض سمجھتا ہے۔ 'اہلِ حدیث' سے تحزّب اور گروہ بندی کی بُو آتی ہے۔ بالکل ویسے ہی جیسے موجودہ دور میں 'حنفیت' اور 'شافعیت' وغیرہ۔ فقہی مذہب ہونے کی جگہ مستقل "دین" بن کر رہ گئی ہیں۔ ہر طرف تحزب اور فرقہ بندی کا زور ہے، ضرورت اصول پر زور دینے اور فروع میں رواداری برتنے کی ہے۔

تیسرا باب

سید احمد شہید رح[1] ۱۲۰۱ھ تا ۱۲۴۶ھ

ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک کے داعی اوّل اور قائد، حضرت سید احمد شہید بریلوی کی ولادت ماہ صفر[2] ۱۲۰۱ھ میں ہوئی۔

تکیہ، رائے بریلی (اودھ) میں حسنی سادات کا مشہور خاندان آباد ہے۔ سادات کا یہ تکیہ (جو دائرہ شاہ علم اللہ رح کے نام سے بھی مشہور ہے) رائے بریلی شہر سے میل ڈیڑھ میل

---

[1] مضمون کے تسلسل کے لئے ہم نے سید صاحب رح کے مختصر حالات درج کردئے ہیں تفصیل کے لئے سوانح احمدی (محمد جعفر تھانیسری) اور سیرت سید احمد شہید (ابوالحسن علی ندوی) کا مطالعہ کیا جائے۔ بعض اصحاب علم نے اعتراض کیا ہے کہ ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک، میں خود اس کے قائد کے حالات میں اختصار سے کیوں کام لیا گیا؟ عرض یہ ہے کہ ہم نے تحریک کے صرف اُس حصے کو اپنا موضوع سخن بنایا ہے جس کے حالات نگاہوں سے اوجھل تھے اور جن کے اظہار سے جاننے والے بھی اب تک ڈرتے تھے۔

[2] عام طور پر مشہور یہ ہے کہ سید شہید کی ولادت پہلی محرم الحرام ۱۲۰۱ھ کو ہوئی۔ مولوی محمد جعفر تھانیسری اور ان کی نقل میں دوسرے تذکرہ نگاروں نے بھی یہی تاریخ درج کی ہے، حالانکہ سید شہید رح کے متعلق سب سے زیادہ مستند کتاب مخزن احمدی (جو ان کے بھانجے مولوی سید محمد علی صاحب کی تصنیف ہے) میں ولادت ماہِ صفر میں درج ہے:۔

"ولادت با سعادت حضرت سید المجاہدین۔ در شہر صفر بعد گزشتن یک ہزار و دوصد سال واقع گردید۔ . . ." (ورق ۱۰ ب: مخطوط)

دور ایک نہایت ہی پُرفضا ٹیلے پر واقع ہے۔ سید صاحبؒ اسی حسنی خاندان کے گوہرِ شب چراغ تھے۔ آپ نے رسمی تعلیم کم پائی۔ مشیت کو کچھ اور کام لینا تھا، معلموں نے لاکھ جتن کیے، پر آپ کی طبیعت مدرسوں کی فرسودہ تعلیم کی طرف مائل نہیں ہوئی۔ مگر اس کے معنی یہ نہیں کہ آپ اُمّی تھے۔ بعض عقیدت مندوں نے خواہ مخواہ انہیں اُمّی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ جب آپ کی عمر تیرہ سال کی ہوئی اور شفیق باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا تو روزگار کی تلاش میں گھر سے چل کھڑے ہوئے۔ لکھنؤ میں ایک مسلمان نواب کے ہاں کچھ دنوں قیام رہا۔ پھر دہلی تشریف لے گئے اور شاہ عبدالقادرؒ صاحب دہلوی (ف ۱۲۳۶ھ) کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا اور شاہ عبدالعزیز صاحبؒ دہلوی (ف ۱۲۳۹ھ) کے دست مبارک پر بیعت کی ـــــ یہ ۱۲۲۲ھ کا ذکر ہے، جب آپ کی عمر ۲۲ سال سے زیادہ نہ تھی۔ دہلی کے اس پہلے سفر کے بعد آپ وطن لوٹ آئے اور تقریباً دو برس وہیں رہے اسی مدت میں آپ نے نکاح کیا۔

اس کے بعد پھر آپ نے راجپوتانہ کا سفر اختیار کیا۔ جہاں نواب امیر خاں کا قیام تھا۔ راستہ میں دہلی ٹھہرتے ہوئے نواب امیر خاں کے پاس پہنچے (تقریباً ۱۲۲۴ھ) سید صاحبؒ کے دل میں جہاد کا شوق تو بدوِ شعور سے موجود تھا ہی، نواب کی فوج میں اس شوق کے عملی جامہ پہنانے کا موقع ملا۔ اور اس غرض سے ایک مدت تک (سوانح احمدی میں یہ مدت سات برس بیان کی گئی ہے) وہاں جہاد کی ترغیب دیتے رہے۔ اس سے یہ غلط فہمی نہ ہو کہ نواب امیر خاں کی فوج میں آپ کا قیام صرف واعظ و مبلغ ہی کی حیثیت سے تھا بلکہ وہ متعدد لڑائیوں میں ایک دستے کے امیر اور نواب کے مشیرِ خاص کی حیثیت سے شریک رہے۔
لیکن جب وہاں کی فضا سازگار نہ رہی، تو مجبوری میں آپ نے پھر دہلی کا رُخ کیا۔ (۱۲۳۱ھ)۔ اصل میں سید صاحبؒ کو توقع تھی کہ نواب کی اعانت سے ہندوستان کے اندر حقیقی جہاد کا موقع پیدا ہو سکے گا۔ مگر جب نواب نے انگریزوں سے صلح کر لی، تو یہ توقع ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی اور دہلی لوٹ کر آپ کو اس غرض کے لئے علیحدہ اور مستقل جد و جہد کرنا پڑی۔

دہلی قدم رکھتے ہی کامیابی نے قدم لئے۔ خاندان ولی اللہی بھی عقیدت مندوں میں شامل ہوگیا۔

خود حضرت شاہ عبدالعزیزؒ (ف ۱۲۳۹ھ) کے داماد مولانا عبدالحیؒ (ف ۱۲۴۳ھ) اور ان کے بھتیجے مولانا شاہ اسمٰعیل شہید (ش ۱۲۴۶ھ) اور خاندان کے دوسرے سرکردہ حضرات آپ کے ہاتھ پر بیعت ہوئے اور ارشاد و ہدایات کا سلسلہ پھیلنے لگا۔ مولانا عبدالحیؒ اور مولانا شہیدؒ کی معیت میں آپ نے ملک کے اطراف و اکناف کے دورے کئے۔ جہاں گئے ان کے دم قدم سے توحید کی تعلیم پھیلی اور شرک و بدعت کی اندھیاری کافور ہوئی۔ سوانح پڑھیئے تو آپ کی تاثیر و جاذبیت کا کچھ عجیب حال نظر آتا ہے۔ اثر پذیری اور جاذبیت کے ایسے دل فریب مرقعے عہدِ صحابہؓ کے بعد پھر دیکھنے میں نہیں آئے۔ بے جا عقیدت اور شخصیت پرستی کے جذبے سے بالکل الگ ہو کر عرض کیا جاتا ہے کہ سید صاحبؒ اور انکے رفیقوں کے قدم جس زمین پر پڑ گئے وہ سونا اُگلنے لگی اور ان کی نگاہیں جن دلوں میں اُتر گئیں وہ حقائق و معارف کا گنجینہ بن گئے۔ ایک مثال ہو تو پیش کی جائے۔ بہرحال نہ جاننے والوں کے لئے عرض ہے۔ بہار کے رئیس زادے اور ناظمِ بہار کے نواسے ولایت علی عظیم آبادی صادق پوری نے لکھنؤ میں شرفِ نیاز حاصل کیا۔ اور نقدِ دل وہیں ہار بیٹھے اور پھر ایسے حلقہ بگوش ہوئے کہ اپنی ذات تو خیر ایک چیز ہے، اپنے پورے خاندان کو قدموں پر لا ڈال دیا۔ اس کے بعد سید صاحبؒ کی تشریف آوری سے پٹنہ مشرف ہوا تو خاندان کے تمام افراد نے بیعت کی اور دامنِ ارادت سے وابستہ ہو گئے۔ اس وابستگی کا نتیجہ دیکھنا ہو تو گورنمنٹ آف انڈیا کے ریکارڈ اٹھا کر دیکھو، مقدماتِ سازش کی رودادیں پڑھو، سرحد اور ماورائے سرحد کی پہاڑیوں اور دشوار گذار گھاٹیوں سے پوچھو! سید صاحبؒ کی شہادت (۱۲۴۶ھ، ۱۸۳۱ء) سے لے کر پورے سو برس تک مسلسل (۱۸۳۱ء-۱۹۳۴ء) جس طرح اس خاندان نے جہاد کا علم سربلند رکھا، وہ قربانی اور سرفروشی کی تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے۔

بات کہاں سے کہاں جا پڑی۔ عرض یہ کرنا تھا کہ سید صاحبؒ اور انکے رفیقوں

نے ۱۲۳۱ھ اور ۱۲۳۶ھ کے درمیان میرٹھ، مظفر نگر، سہارنپور اور شمالی ہند کے بعض دوسرے اضلاع کا دورہ کیا۔ لوگوں کو توحید اور اصلاحِ بدعات کی تلقین کی۔ لاکھوں نے بیعت کی اور ہزاروں آپ کی تبلیغ سے حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے۔ ان ہی دنوں پنجاب میں سکھوں کے ظلم وستم کی روداد یں سننے میں آئیں تو سمندِ شوق کو ایک اور تازیانہ لگا۔ اور عزم[1] بروئے کار لانے کا زمانہ قریب معلوم ہونے لگا۔ مگر پہلے سفرِ حج[2] کو ترجیح دی۔ اثنائے سفر میں ہزاروں نے ہدایت پائی۔ گفتگو اور صحبت میں بلا کی تاثیر تھی۔ سید صاحبؒ کا سفرِ حج بے شمار برکتوں کا باعث ہوا۔ تقریباً تین برس مسلسل سفر میں رہے۔ پہلی شوال ۱۲۳۶ھ عینِ عید کے روز (۲ر جون ۱۸۲۱ء) نماز کے بعد رائے بریلی سے رختِ سفر باندھ کر روانہ ہوئے۔ چار سو مرد، عورتیں اور بچے اس قافلہ میں تھے۔ ہر منزل پر قیام اور تبلیغ کرتا ہوا مبلغین اور مجاہدین کا یہ قافلہ عید الاضحیٰ ۱۲۳۷ھ، ۱۸۲۳ء میں بادلِ محزون و دیدۂ پُرنم علماء و صلحا کا یہ گروہ وطنِ مالوف کی طرف چل کھڑا ہوا۔ ۲۹ر شعبان ۱۲۳۹ھ (۳۰ر اپریل ۱۸۲۴ء) کو (یعنی تقریباً تین برس کی غیر حاضری کے بعد) یہ قافلہ پھر اپنی منزل پر واپس آ گیا۔ مجاہدین کے کرم فرما ولیم ولسن ہنٹر فرماتے ہیں کہ "سید صاحب کو مکہ معظمہ سے نکالا گیا۔ اور ان کے ساتھ بُرا برتاؤ کیا گیا"۔ ہم اس کے برعکس دیکھتے ہیں کہ وہ حج کے

---

[1] راقم پہلے عرض کر چکا ہے کہ سید صاحبؒ کو بدوِ شعور ہی سے جہاد کا شوق تھا اور یہ عزمِ جہاد مسلسل قائم رہا۔ یہ محض اتفاق تھا کہ جس مقام کو انھوں نے اپنا مستقر بنانے کا فیصلہ کیا، وہاں سکھوں سے پہلا مقابلہ پیش آیا ورنہ سید صاحبؒ انگریزوں کو بہرحال سکھوں سے زیادہ خطرناک سمجھتے تھے۔ مکاتیب اور دوسرے مستند وثائق سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ مقصود اس غلط فہمی کا ازالہ کرنا ہے، جو بعض "نیک نیت" لوگوں نے حالات کی تبدیلی سے مجبور ہو کر پیدا کر دی تھی کہ سید صاحبؒ انگریزوں سے جہاد کا مطلق ارادہ نہیں رکھتے تھے۔

[2] آپ کا سفرِ حج بھی مستقل جہاد کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ عام بدامنی اور سفر کی مشکلات کے باعث بعض علماء نے سقوطِ حج کا فتویٰ دے دیا تھا۔ آپ کے رفیقوں مولانا عبد الحی اور مولانا اسماعیل شہیدؒ نے اس فتوے کی علمی تردید بھی کی تھی۔

بعد بھی سات آٹھ مہینے حرم میں اقامت فرماہیں اور بلادِ حرم کے ممتاز علماء آپ کے فیضِ صحبت سے مشرف ہو رہے ہیں۔ غلط بیانی کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔

جہاد

حج کے بعد پھر وعظ و تبلیغ کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ مگر اب کے اصل زور جہاد و ہجرت پر تھا۔ مولانا شہیدؒ اور مولانا عبد الحیؒ اور دوسرے ممتاز حضرات مختلف اطراف میں تبلیغ و ارشاد کے لئے بھیجے گئے۔ ساتھ ساتھ جہاد کی عملی تیاریاں ہونے لگیں۔ اس وقت پنجاب میں "سکھا شاہی" کا زور تھا۔ مسلمانوں کی مسجدیں اور عبادت گاہیں ان کے تصرف میں تھیں۔ غریبوں کی آبرو بھی محفوظ نہیں رہی تھی۔ غرض مظالم کا ایک بے پناہ سیلاب تھا جو پانچ دریاؤں کی مسلم آبادی کو بہائے لیے جا رہا تھا۔ آنکھیں سب کچھ دیکھتی تھیں مگر قوائے عمل مفلوج ہو چکے تھے۔ تیرھویں صدی ہجری (انیسویں صدی عیسوی) کا آغاز مسلمانانِ ہند کے لئے مصیبت و ابتلا کی گھڑی تھی۔ یوں بھی یہاں کبھی اسلامی حکومت نہیں قائم ہوئی، مگر اب تو نام کی مسلمان حکومت کا بھی جنازہ نکل رہا تھا۔ یا نکل چکا تھا۔ جس ملک میں بادشاہ اور کشور کشا کی حیثیت سے صدیوں گلچھرے اُڑاتے رہے۔ اب اس کا چپہ چپہ ان کے خون کا پیاسا تھا۔ اور طرہ تو یہ کہ جس راہ سے وہ ہندوستان داخل ہوئے تھے اور جہاں باہر سے آنے والی قومیں زیادہ تعداد میں آباد تھیں، خود وہاں کی زمین ان پر تنگ ہونے لگی۔ حالانکہ قرب و جوار میں مسلمان نام رکھنے والی چھوٹی بڑی ریاستیں اب بھی موجود تھیں۔ سرحد میں خوانین کے مختلف گھرانے اپنی نسلی شرافت اور روایتی شجاعت پر بدستور نازاں تھے۔ لیکن کشورِ ہند کے طول و عرض میں اگر اللہ کا نام لے کر کوئی اُٹھا، تو وہ چند سر پھرے "مولوی" اور "ملاٹے" تھے۔ مسندِ درس پر "قال اللہ اور قال الرسول" کا کلمہ رٹنے والوں نے میدانِ کارزار میں مسندِ جہاد بچھانے کی ٹھانی یہ اللہ کے بے برگ و نوا بندے صرف اسی کی رحمت و توفیق کے بھروسے پر سید احمدؒ بریلوی کی قیادت میں گھر بار چھوڑ کر چل کھڑے ہوئے۔ خوب معرکہ آرائیاں ہوئیں۔ قرآن و حدیث کا درس دینے والوں نے شمشیر زنی اور توپ افگنی کے خوب خوب جوہر دکھائے، کامیابی و کامرانی ان کے ہم رکاب تھی۔ ظفر مندی قدم لینے کو آگے بڑھی۔ پشاور کی سرزمین

نے اطاعت میں سبقت کی۔ قریب تھا کہ سارا پنجاب وسرحد اسلامی نور سے جگمگانے لگتا اور ایک مرتبہ پھر خلافتِ راشدہ کا عملی نمونہ دنیا کے سامنے آجاتا، مگر ابھی مسلمانوں کے بُرے دن لکھے تھے، بُرا ہو نسلی غرور اور قبائلی عصبیت کا، جس نے اس تمام کئے کرائے پر پانی پھیر دیا۔ کچھ مجاہدین کی ناتجربہ کاری[1]، کچھ علماء سوء کی تفریق انگیز حرکات اور سب پر مستزاد، افغان سرداروں کی جاہلانہ عصبیت، ان سب چیزوں نے مل ملا کر کایا پلٹ دی۔ حنفیت و وہابیت کے جھگڑے الگ کھڑے ہو گئے۔ علماء سوء اور قبر پرستوں نے مجاہدینِ امت پر کفر کے فتوے لگائے، سرحد کے خوانین نے اپنے مرشد سے غداری کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سید شہیدؒ نے بالاکوٹ میں جام شہادت نوش فرمایا۔ مولانا اسمٰعیل شہیدؒ بھی دلی مراد پا گئے

بنا کردند خوش رسمے بہ خاک و خون غلطیدن خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

یہ ۲۴ ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ یوم جمعہ (۶ مئی ۱۸۳۱ء) مشہد بالاکوٹ[2] کا ذکر ہے۔ خامۂ بے نوا! ادب سے سر جھکا اور عرض کر" بالاکوٹ کی سرزمین! تجھ پر اللہ کی ہزار ہزار رحمت کہ تیری خاک میں امت کی بہترین آرزوئیں آسودۂ خواب ہیں۔"

ایک طرف ان نفوسِ قدسیہ کی یہ قربانیاں اور فداکاریاں ہیں اور دوسری طرف ہندوستان کے بے شرم مسلمانوں کی طرف سے "تکفیر و تفسیق" کا صد سالہ لٹریچر، جو بدایوں سے لے کر مدارس تک پھیلایا گیا اور اب تک پھیلایا جا رہا ہے (گو اب تکفیر کی تلوار کند ہو چکی ہے)، خانقاہوں میں بیٹھ کر جوگیوں کی طرح مالا جپنے والے سید احمدؒ اور اسمٰعیل شہیدؒ

---

[1] ایک صاحب علم دوست اس موقع پر" ناتجربہ کاری" کا استعمال نہیں سمجھتے۔ راقم نے پھر غور کیا لیکن اسی نتیجہ پر پہنچا کہ اس" ناکامی" میں" ناتجربہ کاری" کا بھی دخل ضرور رہی تھا۔ مثال کے طور پر یہ حقیقت نمایاں طور پر سامنے آتی ہے کہ افغانی قبائل میں مسلسل دعوت و تبلیغ کے بعد زہن تیار کرنے سے پہلے شرعی حدود کو جاری کر دینا کوئی صحیح طریق کار نہیں تھا۔ اس طرح کی اور مثالیں بھی دی جا سکتی ہیں۔ داعی کو جوش و ولولہ کے ساتھ صبر و تحمل سے بھی آراستہ ہونا چاہیے۔

[2] بالاکوٹ ضلع ہزارہ کے کوہستانی علاقے میں وادی کاغان کے جنوبی دہانے پر واقع ہے۔

یسے مجاہدینِ امت پر کفر کے فتوے لگائیں۔ مسلمانانِ ہند پر اس سے زیادہ اور کوئی منحوس گھڑی نہیں آئی اور بدنصیبی یہ ہے کہ "بدبختیوں نے آج تک اللہ کے ان برگزیدہ بندوں کو معاف نہیں کیا۔ شہدائے بالاکوٹ، کو آج سو برس سے اوپر ہو چکے ہیں، مگر ان پاک ارواح پر "طعن و تشنیع" کا سلسلہ جاری ہے۔

تفو بر تو اے چرخِ گرداں تفو

بالاکوٹ کی تربت میں آرام کرنے والو! تم پر اللہ کی رحمت اور سلام! تمہاری ہڈیاں پھولوں میں رہیں اور اللہ تمہیں شہدار اور صالحین کی صف میں جگہ دے۔

اللھم اغفر لھم واحشرھم فی زمرۃ المھاجرین الاولین الذین ھاجروا وجاھدوا مع نبیك محمدٍ صلی اللہ علیہ وسلم۔

ہم گنہگاران کی مغفرت کے لئے کیا دعا کریں؟ شاید ان کے اعمالِ حسنہ کی یاد میں کچھ ہمارے گناہ بھی معاف ہو جائیں۔

دعوت اور مشن

سید صاحبؒ کی دعوت خالص کتاب و سنت کی دعوت تھی۔ بدعت و شرک کا مٹانا ان کا مشن تھا۔ وہ دینِ محمدیؐ میں عہدِ فاروقی کی پاکیزگی اور شوکت پیدا کرنا چاہتے تھے۔ توحیدِ خالص کی تبلیغ، قبر پرستی کا استیصال، مراسمِ تعزیہ کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنا اور نکاحِ بیوگان کی ترویج، ان کی دعوت کے اہم اجزاء تھے۔ ان کی دعوت کامیاب ہوئی یا ناکام؟ اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ زمانہ شاہد ہے، اور گزشتہ صدی کی تاریخ گواہ ہے۔ کون نہیں جانتا کہ اس وقت تک اسلامی ہند میں جو کچھ اصلاح و تجدید ہو سکی ہے، سب کی سب سید شہیدؒ اور ان کے کفش برداروں کی انتھک کوششوں کا نتیجہ ہے۔ کم سے کم پورب کے علاقوں

---

[1] بعض دوستوں نے راقم کے لہجہ اور تلخئ بیان کی شکایت کی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ان لوگوں کو 'بدبخت' کے سوا اور کیا کہا جائے، جو ان بزرگوں کو گالیاں دے دے کر پورے سو برس سے اپنے نامۂ اعمال کو سیاہ کر رہے ہیں۔ "ریگ کے تودے" "کوہ دماوند" کہنا راقم کے بس کی بات نہیں، اور اگر یہ جرم ہے، تو عاجز کو اس کا اعتراف ہے۔

میں روشنی کی جھلک سراسر اسی آفتابِ عمل کا فیض ہے، صادق پور (عظیم آباد) کا مشہور خاندان سید شہیدؒ اور ان کے ایک مرید مولانا ولایت علی صادق پوری (ف ۱۲۶۹ھ) کی بدولت دنیائے عمل میں آفتاب و ماہتاب بن کر چمکا اور ایک "پورب" پر کیا منحصر ہے دلی، رامپور، جونپور، روہیلکھنڈ، مدراس ــــ اس آفتابِ تجدید کی شعاعیں کہاں نہیں پہنچیں؟ سید صاحبؒ اور ان کے خدام نے ملک کے طول و عرض میں جس طرح اصلاح و محوِ بدعات کا فریضہ ادا کیا ہے۔ اس کی تفصیل کے لئے ایک دفتر چاہیے۔ سینکڑوں واقعات اب تک قلم بند نہیں ہو سکے ہیں۔ اسی قسم کا ایک واقعہ والد ماجد مولانا حکیم محمد عبدالشکور صاحب مدظلہٗ (مولود ۱۲۹۰ھ) نے گزشتہ شوال (۱۳۶۳ھ) کے موقع پر زمانیہ[1] (غازی پور) کے ایک غازی صاحبؒ کا بیان فرمایا تھا، اور اب خادم کی درخواست پر گرامی نامہ مورخہ ۱۹ محرم الحرام ۱۳۶۴ھ میں اس کی تفصیل بھی کر دی ہے۔ نامناسب نہ ہوگا، اگر گرامی نامہ پورا کا پورا یہاں نقل کر دیا جائے:۔

"زمانیہ کے غازی صاحبؒ کے متعلق اتنا یاد ہے کہ اندازاً ۱۳۰۱ھ یا ۱۳۰۲ھ جس زمانہ میں میری عمر بارہ سال کی ہوگی، ایک شخص غازی پور، زمانیہ کے رہنے والے، قد و قامت میں لمبے چوڑے، ضعیف العمر[2]، مگر طاقت و قوت و دلیری میں جوانوں کو مات کرتے تھے۔ تہجد گزار، متبعِ سنت، مولوی کفر توڑ کے نام سے مشہور تھے۔ ان کے ساتھ ایک موٹا عصا جس میں لوہے کا پھل لگا ہوا تھا، ساتھ رکھتے تھے اور کہتے کہ یہ کفر توڑ ہے۔ جہاں کہیں جاتے، ان کا کام یہ تھا کہ جہاں امام باڑہ کا چبوترہ دیکھتے، اسی کفر توڑ سے اکھاڑتے۔ جب وہ بنارس میں میری موجودگی میں پہنچے تو مولوی محمد سعید صاحب[3] مرحوم کے یہاں قیام کیا۔ محلہ دارانگر کی مسجد میں (جس میں مولوی صاحب مع اپنے طلباء و متبعین کے نماز پنجگانہ

---

[1] مشرقی یوپی کے ضلع غازی پور کا ایک مشہور قصبہ۔

[2] حساب سے کم سے کم ان کی عمر (۷۰ اور ۸۰) کے درمیان ہوتی ہے۔

[3] مولانا محمد سعید صاحب کنجاہی بنارسی (ف ۱۳۲۲ھ ۱۹۰۴ء) تراجم علمائے حدیث ہند۔ ص ۳۵۶-۳۵۳

ادا کرتے تھے) صحنِ مسجد کے وسط میں ایک چبوترہ مربع تھا۔ جس[1] پر تعزیہ رکھا جاتا تھا۔ تین چار روز تک بڑا ہنگامہ رہتا تھا۔ جب مولوی کفر توڑ صاحب پہنچے تو انہوں نے چبوترے کو اکھیڑ کر پھینک دیا۔ چونکہ اس محلے میں مولوی صاحب مرحوم کے ماننے والوں کی تعداد زیادہ تھی اس لئے کچھ فساد نہیں ہوا۔ مولوی کفر توڑ صاحب مرحوم سید صاحب علیہ الرحمۃ اور مولانا شہید علیہ الر کے ساتھ جہاد میں برابر شریک رہے۔ بعد شہادت سید صاحبؒ کے وہ ہندوستان اپنے وطن میں رہنے لگے۔ ان کے جسمِ مبارک پر گولیوں اور نیزوں کے متعدد نشانات تھے، جس کو ہم لوگوں نے دیکھا۔ انھوں نے ہم چند لڑکوں کو جن میں ہمارے اخ معظم[2] مرحوم تھے۔ ایک روز تہجد کی نماز پڑھائی اور دعاء ماثورہ اللھم اجعل فی قلبی نوراً الخ لکھ کر پڑھوائی، اور کہا کہ روزمرہ سویرے ایک مرتبہ پڑھ لیا کرو۔ اُسی کا اثر تھا کہ کافیہ، تہذیب، سلّم وغیرہ آسانی سے یاد کر لیتا تھا۔ اس زمانے میں کافیہ پڑھتا تھا۔"

مولانا ابو الکلام آزاد مدظلہ نے تذکرہ[3] میں لکھا ہے کہ اسلامی ہند میں بنائے تجدید کی ابتدا حضرت مجدد سرہندیؒ (ف ۱۰۳۴ھ) نے کی۔ اور تعمیر و تزئین امام ولی اللہ دہلوی (ف ۱۱۷۶ھ) کے ہاتھوں سے ہوئی۔ مگر "خاک و خون سے کھیلنا" تتمہ دودمانِ ولی اللّٰہی، مولانا اسمٰعیل شہیدؒ (۱۱۹۶ھ - ۱۲۴۶ھ) کے لئے مقدر کیا گیا تھا۔ مولانا کے خیال میں تجدید و اصلاح کی تکمیل اور مقامِ امامت کی صحیح عملی تفسیر حضرت شہیدؒ دہلوی نے کی ہے۔ مولانا آزاد کو

---

[1] یہ محلہ دارانگر (بنارس) کی مسجد کا حال تھا۔ جہاں اہلِ حدیث حضرات کی اکثریت تھی دوسری جگہوں کا جو حال ہوگا اسی پر قیاس کر لیجیے۔ والد ماجد فرماتے تھے کہ ان دنوں عام طور پر مسجدوں میں امام باڑے ہوا کرتے تھے۔ اور اچھے اچھے عالم بھی اس پر ہاتھ رکھنے کی جرأت نہیں کرتے تھے۔

[2] والد ماجد مولانا عبدالشکور مدظلہ اور میرے بڑے چچا مولانا عبدالرؤف صاحب مرحوم دونوں نے اپنے پھوپھی زاد بھائی مولانا سید عبدالکبیر صاحب بہاری (ف ۱۳۳۱ھ ۔ ۱۹۱۳ء، تراجم علمائے حدیث ص ۳۶۴-۳۶۳) کی نگرانی اور سرپرستی میں دارانگر، بنارس میں ابتدائی تعلیم حاصل کی اور تکمیل کانپور اور علی گڑھ میں کی۔

[3] تذکرہ ص ۲۴۴-۲۴۶

تمام جہادی سرگرمیوں میں، مولانا شہیدؒ ہی کی روح کارفرما نظر آتی ہے۔ استاذ محترم مولا
سید سلیمان ندوی مدظلہ، سید صاحبؒ اور مولانا شہیدؒ دونوں بزرگوں کو "تجدیدِ دین
کی تحریک" کا امام سمجھتے ہیں[۱]۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی "شہیدین" کو امام ولی اللہ کی تح
کا تتمہ سمجھتے ہیں[۲]۔ راقم کو مولانا ابوالکلام آزاد سے زیادہ اور ان دونوں بزرگوں سے تھوڑا
سا مؤدبانہ اختلاف ہے۔ ہمارے نزدیک مجدد سرہندیؒ اور امام ولی اللہ دہلویؒ کی تیار کردہ
عمارت کی تکمیل حضرت شہیدؒ دہلوی کے پیرومرشد حضرت شہیدؒ بریلوی کی ذاتِ گرامی سے
ہوئی ہے۔ اپنا اپنا تاثر اور اپنا اپنا وجدان ہے۔

وللناس فیما یعشقون مذاہب

راقم نے خود مولانا آزاد مدظلہ، کی خدمت میں ایک موقع پر (لکھنؤ کانگریس ۳۶ء) اپنا
خیال پیش کیا تھا۔ مولانا نے جواب دیا کہ "میرا ذاتی تاثر وہی ہے"۔ بہرحال اگر مرید و عقیدتمند
ہی کی قسمت میں یہ بلند مرتبہ تھا تو پیرومرشد کے مراتب عالیہ کا اندازہ کون لگا سکتا ہے[۳]؟

دعوت کا اہم عنصر

سید صاحب کی دعوت کا اہم عنصر جہاد فی سبیل اللہ ہے، اور یہی چیز اس تحریکِ تجدید و جہاد کو نجد کی دعوت توحید سے خاص
طور پر ممتاز کرتی ہے۔ سید صاحبؒ کا کوئی وعظ یا مکتوب ترغیبِ جہاد سے خالی نہیں ہوتا۔
انھوں نے صرف وعظ پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنے مریدوں کے ساتھ گھر بار چھوڑ کر سرحد تشریف
لے گئے جیسا کہ اوپر بیان ہوا، سکھوں کے مظالم ان کے سامنے تھے۔ مسلمان عورتوں کی عصمت و
آبرو محفوظ نہیں رہی تھی۔ ان کا خون حلال ہو چکا تھا۔ گائے کی قربانی ممنوع تھی۔ مسجدوں
سے اصطبل کا کام لیا جا رہا تھا۔ غرض وہاں وہ سب کچھ ہو رہا تھا جس کا نقشہ عارف سیالکوٹی
نے اپنے اس شعر میں کھینچا ہے ؎

---

[۱] مقدمہ سیرت سید احمد شہیدؒ۔

[۲] تجدید و احیائے دین۔ ص ۷۰۔ ۶۹

[۳] مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو:۔ راقم کی کتاب "مولانا سندھی اور ان کے افکار و خیالات پر ایک نظر (ص ۴۵-۴۰)

خالصہ شمشیر و قرآں را ببرد اندر آں کشور مسلمانی بمرد

انہیں حالات[1] سے متاثر ہو کر سید صاحبؒ نے باضابطہ جہاد کا اعلان کیا۔ سکھوں کو پہلے اسلام کی دعوت دی۔ پھر معرکہ آرائی شروع ہوئی۔ جدھر کا رُخ کیا کامیابی قدم لینے کو آگے بڑھی، سید صاحبؒ کی قوت روز بروز بڑھتی گئی۔ مجاہدین نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی، آپ کی "امارت" کا اعلان ہوا۔ (۱۸۲۶ء) خطبوں میں آپ کا نام پڑھا جانے لگا۔ دُور اور نزدیک سے اطاعت اور معاونت کے پیام آنے لگے ۔ ۔ ۔ مگر ہمارے بعض بزرگ کہتے ہیں[2] کہ یہ "بیعت امارت" ڈکٹیٹر شپ کا اعلان تھی اور مجاہدین نے سید صاحبؒ کے دست مبارک پر "امامت و امارت" کی بیعت کر کے سخت غلطی کا ارتکاب کیا۔ راقم عرض کرتا ہے کہ اگر سید صاحبؒ کی امارت ڈکٹیٹر شپ تھی، تو پھر سیدنا ابوبکر صدیقؓ اور سیدنا عمر فاروقؓ کی خلافت بھی ڈکٹیٹر شپ تھی۔ اور اگر یہ بیعت کوئی غلط چیز ہے، تو اس سے پہلے صحابہ کرامؓ نے بھی اس قسم کی غلطیوں کا ارتکاب کیا ہے۔ آخر ہم ساحرانِ فرنگ کی ابلہ فریبیوں کا کب تک شکار بنے رہیں گے؟ جمہوریت کی "نیلم پری" کا مکروہ چہرہ بے نقاب ہوا اور دنیا عارف سیالکوٹی کی زبان سے پکار پکار کر کہہ رہی ہے۔

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری

اور آج یہ حقیقت بھی ام نشرح ہو چکی ہے۔

کہ از مغز دو صد خر کارِ فکر انسانے نمی آمد

---

[1] ہم کہیں اوپر لکھ آئے ہیں کہ سید صاحب کے دل میں جذبۂ جہاد بدو شعور ہی سے پرورش پا رہا تھا۔ اور آگے بڑھ کر اقامتِ دین کا مقصدِ بلند ان کے دل و دماغ میں جاگزیں ہو گیا تھا۔ ان کی دُور بیں نگاہوں سے یہ بات بھی اوجھل نہیں تھی کہ اصل خطرہ کہاں ہے؟ اور جہاد کی مہم کا صحیح رُخ کیا ہونا چاہیئے؟ لیکن موقعِ جنگ اور پنجاب کے مخصوص حالات نے انہیں پہلے سکھوں سے نپٹ لینے پر مجبور کر دیا یہ اور بات ہے کہ اصل حریف سے پنجہ آزمائی سید صاحبؒ کی شہادت کے بعد ہی ہوئی۔

[2] ملاحظہ ہو:۔ مولانا سندھیؒ کی شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک ص ۱۱۶-۱۵۳-۱۶۸ (طبع اوّل)

عرض یہ کر رہا تھا کہ سید صاحبؒ کی امامت و امارت پر باضابطہ بیعت ہوئی (۱۲ر جمادی الآخرہ ۱۲۴۲ھ، ۱۱ر جنوری ۱۸۲۷ء) اور ہند و بیرونِ ہند کے اہل فکر و نظر نے اس کی دلی تائید کی۔ لیکن اپنی بدنصیبی کا ماتم کن لفظوں میں کیا جائے؟ دل میں ایک ہوک اٹھتی ہے اور آنکھوں میں خون اتر آتا ہے، جب کبھی ملانوں کے فتوے اور خوانینِ سرحد کی غداری یاد آتی ہے۔ مگر یہاں توجی کڑا کر کے کسی نہ کسی طرح رودادِ الم، قلم بند کرنا ہے مختصر طور پر یوں سمجھیے کہ جاہل ملانوں نے مجاہدین کو 'وہابی' کہنا شروع کیا۔ جن کی اصلاح و بہبودی اور امداد و معاونت کے لئے اس بے برگ و نوسید زادےؒ اور اس کے جاں نثاروں نے ہجرت کی مشقتیں گوارا کیں۔ وہ خود جان کے دشمن ہو گئے کھانے میں زہر بھی دیا گیا۔ پشاور فتح ہو چکا تھا مگر سردارانِ پشاور کی غداری کے باعث سید صاحبؒ کے مقرر کردہ عمّال اور ان خاص اصحاب کا قتلِ عام ہوا۔ اور پھر اتنی بددلی ہوئی کہ وہ نواحِ پشاور کو چھوڑ کر وادی کاغان سے متصل راج دواری کی وادی کو منتقل ہو گئے (شعبان ۱۲۴۶ھ) وہاں سکھوں سے چھیڑ چھاڑ ہوتی رہی۔ آخر بالاکوٹ میں وہ آخری معرکہ پیش آیا۔ جس کا اجمالی تذکرہ اوپر آچکا ہے۔ مقامی خوانین ذاتی کشمکش میں مبتلا تھے۔ ان میں سے ایک جماعت تو سید صاحبؒ کے ساتھ تھی۔ اور کچھ لوگ سکھوں کے مددگار و معاون رہے۔ سکھوں کے ان مقامی ہمدردوں کو تمام راستوں اور پر پیچ گھاٹیوں کا پورا پورا علم تھا۔ انہیں کی نشاندہی کی بدولت اس آخری معرکے میں سکھوں کو ناگہانی طور پر عقب سے حملہ آور ہونے کا موقع مل گیا۔ بس پھر کیا تھا مجاہدین جان پر کھیل کر لڑے۔ موت سامنے تھی اور شہادت کی آرزو دلوں میں بسی ہوئی تھی۔ لڑے اور اس طرح کہ دشت و جبل نعرۂ حق سے گونج اٹھے اور کون کہہ سکتا ہے کہ آج بھی بالاکوٹ کے اِرد گِرد اُس نعرۂ حق کی گونج نہیں سُنائی دیتی ہوگی؟ ؎

ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق — ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

مولانا اسمٰعیل شہیدؒ اور خود سید صاحبؒ نے بھی اسی معرکے میں جامِ شہادت نوش فرمایا۔ (۲۴ر ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ)

شہادت یا غیبوبت

بالاکوٹ کا حادثہ کچھ اس طرح پیش آیا کہ شہدار کی تجہیز و تکفین بھی غیروں ہی نے کی۔ ان کی قبروں کا بھی ٹھیک ٹھیک علم نہیں۔ خود سید صاحبؒ نے بعض ایسی پیش گوئیاں کی تھیں جن سے بعض کمزور دلوں میں یہ خیال پیدا ہو گیا کہ سید صاحبؒ شہید نہیں ہوئے بلکہ نگاہوں سے اوجھل ہو گئے ہیں اور دوبارہ ظاہر ہو کر دنیا کو شرک و بدعت سے پاک کریں گے ـــــ یہ خیال ایک عرصہ تک سید صاحب کے.... عقیدت مندانِ خاص کے دلوں میں جاگزیں رہا۔ اسی انتظار میں کتنے بیٹھے رہے اور بے نیل و مرام اس دنیا سے اُٹھ گئے۔ سید صاحبؒ کے عقیدت مندوں اور اُن کے نقشِ قدم پر "گھر بار لٹانے والوں" کا سب سے بڑا قافلہ[1] صادق پور[2] (پٹنہ) میں آباد تھا۔ (وہ چمن تو ۱۸۶۵ء کی خزاں میں اُجڑ چکا۔ مگر اس کی نشانیاں "آشیانے" کے اِردگرد باقی ہیں اور ان کی اولاد اب تک وہیں مقیم ہے) ان میں یہ خیال عرصۂ دراز تک قائم رہا۔ بعضے بڑے مخلص اور متبع سنت علما، اس "توہم" کے شکار ہوئے اور شاید اب بھی ان کے دلوں سے یہ عقیدہ نہیں نکل سکا ہے گو درایت و عقل کی رو سے وہ سید صاحبؒ کی شہادت کو تسلیم کرتے ہیں۔

یہ فرطِ محبت کی لغزش تھی۔ گو لغزش بہرحال لغزش ہے اور یہ کوئی معمولی لغزش نہیں، پھر بھی ان کے حالات پر نظر رکھ کر زبانِ طعن دراز کرنے سے پہلے ذرا سوچ لینا چاہیئے مولانا

---

[1] خاندانِ صادق پور کے خاندانی مکان کو عرفِ عام میں "قافلہ" کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔

[2] صادق پور، شہر عظیم آباد، پٹنہ کا ایک محلہ ہے۔ اس کی آبادی پرانے شہر (موجودہ پٹنہ سٹی) کے مغربی دروازے سے بالکل ملی ہوئی ہے۔ یہاں شرفائے بنو ہاشم کا ایک مشہور خاندان عرصہ دراز سے آباد ہے جو علمی وقار اور دنیوی وجاہت، ہر لحاظ سے دُور و نزدیک عزت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔ اسی خاندان کے گوہر شب چراغ مولانا ولایت علی (ف ۱۲۶۹ھ) تھے جو زمانۂ طالب علمی ہی میں لکھنؤ میں سید صاحبؒ سے بیعت ہوئے اور پھر سارے خاندان کو اس "راہ" کا مسافر بنا دیا جس مقام پر ان کا پرانا عالیشان مکان (جو دعوتِ جہاد کا عرصہ دراز تک مرکز رہا ہے اور اسی مناسبت سے "قافلہ" کے نام سے یاد کیا جاتا تھا) اب وہاں پٹنہ سٹی میونسپلٹی کی عمارت قائم ہے ـــ اب یہ سوال کہ پٹنہ سٹی میونسپلٹی کی عمارت کس طرح تعمیر ہوئی؟ اور اس عالیشان محل کا نام و نشان آج کیوں نہیں ملتا؟ اس کا جواب آئندہ صفحات میں کچھ مل سکے گا۔

ابوالکلام آزاد مدظلہ، (جو مولانا محمد یوسف صاحب رنجور عظیم آبادی صادق پوری (ف ۱۳۴۱ھ) کی صحبت میں عرصے تک رہے اور اس لئے اہل صادق پور کے احوال و کیفیات سے اچھی طرح واقف ہیں)، کا تاثر یہ ہے کہ گرتے ہوئے دلوں کو "تھامنے" کے لیے یہ شوشہ چھوڑا گیا تھا۔ ہم نے ابھی کہا ہے کہ لغزش بہر حال لغزش ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ سچے اور بے ریا لوگوں پر افترا اور بہتان تراشا جائے۔

حکمتِ ولی اللّٰہی کے علم بردار مولانا عبید اللہ سندھیؒ (ف ۱۳۶۳ھ) نے مولانا ولایت علی صادق پوری (ف ۱۲۶۹ھ) اور ان کے دوسرے رفیقوں اور ماننے والوں کو 'شیعیت' اور 'زیدیت'، کا نام لگا کر جس طرح مطعون اور بدنام کرنے کی ناروا کوشش کی ہے[1]، اسے تحریکِ تجدیدِ جہاد، کا مورخ کسی طرح نظر انداز نہیں کر سکتا۔ ہم مولانا سندھیؒ کی قربانیوں اور علم و فضل کا انکار نہیں کرتے، بلکہ سچے دل سے ان کا اعتراف کرتے ہیں، لیکن سید شہیدؒ اور اُن کے "اصحابِ باصفا" کا آنا ان کو زیب نہیں دیتا۔ اور اگر قربانیوں اور فداکاریوں کے طفیل مولانا سندھیؒ کی لغزشیں قابلِ درگزر ہیں (جیسا کہ ان کے ایک عقیدت مند نے لکھا ہے)، تو پھر سید شہیدؒ کے اصحابِ خاص کی فروگزاشتیں اور بھی زیادہ قابلِ درگزر ہوں گی؟ کیا وہ اور ان کے معتقدین ان مجاہدینِ راہِ حق کی قربانیوں اور فداکاریوں سے بے خبر ہیں؟

اصلی نصب العین تاسیس حکومتِ الٰہیہ

پچھلے دو تین برسوں میں حضرت سید شہیدؒ اور ان کی تحریک تجدید جہاد کے متعلق جہاں اور غلط بیانیاں کی گئی ہیں، وہاں یہ بھی کہا گیا ہے[2] کہ سید صاحبؒ کی جماعت دہلی کی سلطنت کی "کمزوری کو دور کرنے کے لئے کھڑی" ہو رہی تھی۔ حالانکہ سید صاحبؒ اور ان کے مقصدِ جہاد کی اس سے زیادہ اور کوئی تنقیص نہیں ہو سکتی۔ سید صاحبؒ مکمل اسلامی نظام کے داعی

---

[1] ملاحظہ ہو:۔ مولانا سندھیؒ کی شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک ص ۱۵۹۔ ۱۶۱۔ ۱۹۵۔ ۲۱۱ اور راقم کی کتاب 'مولانا سندھیؒ اور ان کے افکار و خیالات پر ایک نظر ص ۴۶۔ ۸۷

[2] شاہ ولی اللہ اور انکی سیاسی تحریک ص ۷۵۔ اور مولانا سندھی اور ان کے افکار پر ایک نظر ص ۱۱-۱۲

تھے۔ دہلی کی حکومت کو ان کے بلند مقاصد سے کیا نسبت؟ کون نہیں جانتا کہ دہلی کی حکومت خاندانی شخصی حکومت تھی اور خلافتِ راشدہ کے نمونے پر حکومتِ الٰہی کی تاسیس کرنا سید صاحبؒ کا نصب العین تھا۔ سید صاحب کا مقصد و نصب العین اس قدر واضح اور روشن ہیں کہ ان میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہونا چاہیئے تھی۔ ان کا جہاد خالص اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے تھا۔ یہ موافق و مخالف سب پر عیاں ہے مگر جب ایک غلط بیانی علم و تحقیق کا جامہ پہن کر منظرِ عام پر آچکی ہے تو اس کی صاف و واضح تردید بھی ضروری ہے۔ لیجئے جہاد و ہجرت اور نصب امامت کا مقصدِ عالی خود سید صاحبؒ کی زبان سے سنئے۔ سردار سلطان محمد خاں اور سردار سعید محمد خاں کو تحریر فرماتے ہیں :۔

رب غیور کہ علیم بذات الصدور است آگاہ است برایں معنی کہ ایں جانب را از قبولِ ایں منصب غیر از اقامتِ جہاد بروجہِ مشروع حصولِ معنی انتظام در عساکر اہلِ اسلام غرضِ دیگر از اغراضِ نفسانیہ نیست ــــ آرے ایں قدر آرزو دارم کہ در اکثر افراد بنی آدم بلکہ در جمیع اقطارِ عالم احکام رب العالمین کہ مسمی بشرع متین است بلامنازعت احدے نافذ گردد۔

رب غیور جو کہ دلوں کا حال اچھی طرح جانتا ہے، اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہے کہ اس منصب (امامت) کے قبول کرنے سے اس کے سوا میری کوئی دوسری نفسانی غرض نہیں کہ جہاد کو شرعی طریقے پر قائم کیا جائے اور مسلمانوں کی فوجوں میں نظم قائم ہو۔ ہاں! اس قدر آرزو رکھتا ہوں کہ اکثر افرادِ انسانی بلکہ تمام ممالک میں رب العلمین کے احکام جن کا نام شرعِ متین ہے، بلا کسی کی مخالفت کے جاری ہو جائیں۔

(سیرت سید احمد شہید[1] : ص ۱۱۰ــ۱۱۱)

کیا اس کے بعد بھی کہا جائے گا کہ سید صاحبؒ دلّی کی حکومت کی کمزوری دُور کرنے کے لئے کھڑے ہوئے تھے؟

مشہور خلفاء سید صاحبؒ کے دستِ مبارک پر بے شمار علماء نے جہاد و اصلاح کی بیعت کی۔ ایک اچھی خاصی تعداد سرحد و پنجاب کے معرکوں میں کام آئی۔

---

[1] مزید تفصیل کے لئے: سیرت سید احمد شہیدؒ (ص ۱۷۰۔ ۱۵۹) ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

دوسروں نے شرک وبدعت کے مٹانے میں بڑی نمایاں خدمتیں انجام دیں اور بلاشبہ آج اسلامی ہند میں جو کچھ صحیح الخیالی اور اتباعِ "سنت" کا جذبہ پایا جاتا ہے۔ وہ ان ہی اربابِ صدق وصفا کی کوششوں کا رہینِ منت ہے۔

یوں تو خلفاء کی تعداد بہت ہے لیکن ان میں مشہور ترین اصحاب کے نام یہ ہیں :۔

۱۔ مولانا عبدالحیؒ بڈھانوی (ف ۱۲۴۳ھ) ۲۔ مولانا اسمٰعیل شہیدؒ (ش ۱۲۴۶ھ)
۳۔ مولانا ولایت علیؒ صادق پوری (ف ۱۲۶۹ھ) ۴۔ مولانا محمد علیؒ رامپوری (ف ۱۲۵۸ھ)
۵۔ مولانا سخاوت علیؒ جونپوری (ف ۱۲۷۴ھ) ۶۔ مولانا کرامت علیؒ جونپوری (ف ۱۲۹۰ھ)

ان میں مولانا عبدالحیؒ داماد مولانا شاہ عبدالعزیز صاحبؒ اپنے پیرومرشد کی زندگی ہی میں وفات پاگئے۔ مولانا اسمٰعیلؒ نے بالاکوٹ میں اپنے پیر اور امیر کا حقِ رفاقت ادا کیا۔ مولانا سخاوت علی (مولود ۱۲۲۶ھ) اور مولانا کرامت علی (مولود ۱۲۱۵ھ) نسبتاً کم عمر تھے۔ مولانا سخاوت علی نے مکہ معظمہ کو ہجرت کی اور وہ بڑی حد تک اپنے شیخؒ کے مسلک اور طریقے پر قائم رہے، مولانا کرامت علی (ف ۱۲۹۰ھ) نے بڑی عمر پائی اور بنگال میں ایک عرصے تک وہ تبلیغی دورے کرتے رہے، مگر ان کی روش اپنے شیخؒ اور ان کے اصحابِ خاص کے مشرب سے الگ ہوگئی تھی[۱]۔ رہ گئے مولانا محمد علی رامپوری اور مولانا ولایت علی صادق پوری۔ ان دونوں

۱؎ مجاہدین اور اتباع سید احمد شہیدؒ کے سب سے بڑے واقف کار مسٹر جیمس اوکنلی (JAMESOKINLEY) نے شہادت دی ہے کہ مولوی کرامت علی صاحب برطانوی حکومت کے اور وہابیوں کے پکے مخالف PERSISTENT OPPONANT OF WAHABIS تھے۔ یہ تصدیق نامہ راج محل (بہار) میں ۱۲ اکتوبر ۱۸۷۰ء کو دیا گیا تھا۔ جسے خود ان کے پوتوں نے فخریہ ۱۹۱۴ء میں طبع کرادیا تھا (وہ خوبصورت اور نظر فریب پمفلٹ راقم کی نظر سے گذر چکا ہے) اس میں ان کے صاحبزادے مشہور ادیب مولوی عبدالاول صاحب جونپوری اور حافظ احمد صاحب کی وفاداری کی بھی تصدیق ہے۔ ان کے علاوہ راقم بھی یہ اچھی طرح جانتا ہے کہ عقائد واعمال میں وہ سید صاحبؒ کے اصحابِ خاص کی روش سے بالکل الگ تھے۔ سیرت سید احمد شہیدؒ طبع دوم ص ۲،۸ ۔ ۳،۲ کے بیانات سے غلط فہمی کا اندیشہ ہے اس لئے راقم نے ضروری خیال کیا کہ یہ حقیقت واضح کردی جائے۔

بزرگوں کو خود سید صاحبؒ نے میدانِ جہاد ہی سے مدراس اور دکن تبلیغی مہم پر بھیج دیا تھا اور دونوں نے اپنے فرائض سچے جوش اور ولولے کے ساتھ انجام دئے۔ شہادت کی خبر ان دونوں بزرگوں کو علی الترتیب مدراس اور دکن ہی میں ملی۔ اس کے بعد مولانا محمد علیؒ وطن کو لوٹ آئے، پھر دوبارہ مدراس تشریف لے گئے (۱۲۵۱ھ) اور وہاں آپ کو علماء سوء اور بدعت نواز مسلمانوں نے بڑی تکلیفیں دیں۔ اس لئے دوسری مرتبہ وہاں زیادہ قیام نہ ہوسکا، اور واپس چلے آئے (اواخر ۱۲۵۲ھ) اپنی عمر کے آخری چھ سال آپ نے تذکیر و تبلیغ میں صرف کئے اور ۱۲۵۸ھ میں وفات پائی۔

چوتھا باب

سیّد صاحبؒ کے بعد

مولانا ولایت علیؒ صادق پوری

ابھی اوپر گذر چکا ہے کہ حادثۂ بالاکوٹ کے وقت سید شہیدؒ کے دو بڑے اور ممتاز رفیق مدراس اور دکن میں تبلیغی خدمات پر مامور تھے۔ مشیتِ الٰہی یہی تھی کہ سیّد صاحبؒ کے بعد بھی "آگ و خون" کی ہولی کھیلی جاتی رہے، میدانِ جہاد سے ان دونوں بزرگوں کی دُوری اور سلامتی میں بھی رازِ[1] پنہاں معلوم ہوتا ہے۔ بہرحال مولانا محمد علیؒ رامپوری (ف ۱۲۵۸ھ) فاجعۂ شہادت (۱۲۴۶ھ) کے بعد بارہ سال تک خاموش طریقہ سے تبلیغ واصلاح کے مفید کام کرتے رہے، مگر وہ کہ جس کے کندھوں پر سید شہیدؒ کی جانشینی کا بار پڑ گیا تھا، اس کی روش اس خاموش طریقۂ "تبلیغ" سے الگ رہی ـــــ فاجعۂ بالاکوٹ کے بعد تمام ملک پر اُداسی چھائی ہوئی تھی۔ جماعت تتّر بتّر ہوگئی۔ اچھوں اچھوں کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ جہاد کا سارا "کام" درہم برہم ہوا چاہتا تھا کہ عظیم آباد، پٹنہ محلہ صادق پور کے ایک فرد نے یہ گرتا ہوا علم اپنے ہاتھوں سے تھام لیا اور زندگی بھر اپنے سینے سے لگائے رکھا اور پھر اس فرد "کامل" کے بعد، اُس کے بھائیوں، بھتیجوں، عزیزوں اور ماننے والوں نے جس طرح اپنے خون سے اس نخلِ خزاں دیدہ

---

[1] مولانا ولایت علی صاحبؒ پر میدانِ جہاد سے علیٰحدگی اور سید صاحبؒ کی جدائی بہت شاق تھی، سید صاحبؒ نے آپ سے فرمایا کہ "مولانا ہم آپ کو تخم کر کے اٹھاتے ہیں" یعنی اس ایک تخم سے ہزاروں درخت پیدا ہوں گے۔

کی آبیاری کی ہے، وہ اسلامی ہند کی پوری تاریخ میں اپنی آپ مثال ہے۔ افسوس کہ ولیم ولسن ہنٹر (W. W. HUNTER) کی گمراہ کن اور اشتعال انگیز کتاب ہندوستانی مسلمان[1] THE INDIAN MUSALMANS کے سوا ان کشتگانِ خنجرِ تسلیم کے متعلق اور کوئی چیز اُردو میں نہیں آئی۔ مولانا عبدالرحیم صاحب صادق پوری (مولود ۱۲۵۲ھ، اسیر انڈمان ۱۸۶۴ء، ۱۲۸۰ھ، ۱۸۸۳ء، ۱۳۰۰ھ متوفی درعظیم آباد ۱۳۴۱ھ) کی تذکرہ، صادقہ، مولوی محمد جعفر صاحب تھانیسری (اسیر انڈمان، متوفی ۱۹۰۵ء) کی تاریخِ عجیب میں بکھرے ہوئے معلومات ملتے ہیں مگر ان کتابوں کو اب پڑھتا کون ہے؟ مولانا ابوالحسن علی ندوی نے سیرت سید احمد شہید میں انہیں مآخذ سے لے کر اچھی خاصی مرتب اور مسلسل روداد الم قلم بند کر دی ہے مگر آنسو کے ان چند قطروں سے اس پاک اور طاہر خون کا حق تو ادا نہیں ہو سکتا جو مسلسل سو برس (۱۸۳۱ء - ۱۹۳۴ء) بنگال کے مشرقی اضلاع سے لے کر سرحد اور ماورائے سرحد کی پتھریلی اور پیاسی زمینوں تک بے دریغ بہایا گیا۔ حق یہ ہے کہ ان بلاکشانِ راہِ عزیمت کا ادنیٰ حق بھی اب تک ادا نہیں ہو سکا ہے۔ خود یہ گنہگار اس "کوتاہی" کا معترف ہے اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہے کہ وہ مستقبلِ قریب میں اس فرضِ کفایہ سے سبکدوش ہونے کے قابل ہو۔

راقم کا کچھ عجب حال ہے، جہاں مجاہدینِ راہِ حق کا ذکر آیا، وہ تمام "اگلی اور پچھلی" بے انصافیاں اور غلط بیانیاں ایک ایک کر کے یاد آنے لگتی ہیں، جو "اربابِ ہوا و ہوس" نے ان بزرگوں کے متعلق روا رکھی ہیں اور راہوارِ قلم بے قابو ہونے لگتا ہے۔ بہرحال

---

[1] اللہ مغفرت کرے مولوی طفیل احمد صاحب مرحوم نے ہنٹر کی کتاب کے اتنے اقتباسات اپنی کتابوں میں دیئے اور ایک مشہور عالم نے اپنی تقریروں میں اس کثرت سے اس کے حوالے پیش کئے کہ عام طور پر لوگوں کو اس دریدہ دہن مصنف اور اس کی کتاب سے "ہمدردی" پیدا ہو گئی ہے حالانکہ یہ کتاب اس قدر کی مستحق نہیں تھی۔ نہ اس کی تحقیق ہی اچھی ہے اور نہ اس کی زبان ہی شائستہ ہے۔ اس کی "تہذیب" و "شائستگی" کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ سید شہیدؒ کو ڈاکو (ROBBER) رہزن BANDIT اور فریبی IMPOSTER کے الفاظ سے یاد کرتا ہے۔ (نیا ایڈیشن۔ ص ۴، ۵۷، ۳۰۴)

عرض یہ کرنا تھا کہ مشہدِ بالاکوٹ (۱۲۴۶ھ، ۱۸۳۱ء) پر سید صاحبؒ کی شروع کی ہوئی تحریکِ تجدید و جہاد بالکل ختم نہیں ہوئی بلکہ سید صاحب کی شہادت کے بعد قیادت کی باگ مولانا ولایت علی صادق پوری عظیم آبادی (مولود ۱۲۰۵ھ) نے اپنے ہاتھوں میں لے لی۔[1] ابھی وہ دکن میں تبلیغ و ارشاد کے فرائض انجام دے رہے تھے کہ فاجعۂ بالاکوٹ پیش آیا۔ امیر و شیخؒ کی شہادت کی خبر سنتے ہی وہ عظیم آباد واپس ہوئے اور دعوت و تبلیغ کی از سرِ نو تنظیم شروع کی۔ بنگال، بہار، دکن، مدراس، مختلف صوبوں کو مبلّغ بھیجے، ردِّ بدعت پر متعدد کتابیں شائع کیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنے خاندان میں عمل بالسنّت کی تجدید کی۔ صوبۂ بہار و بنگال میں نکاحِ بیوگان کا آغاز آپ ہی کے خاندان سے شروع ہوا،[2] جس طرح ہندوستان میں نکاحِ بیوگان کی پہلی مثال خود سید شہیدؒ نے اپنے خاندان میں قائم کی تھی۔ اس نکاح کا بڑا شور و غل رہا، پھر "بڑے حضرت" (مولانا ولایت علی صاحبؒ اپنے خاص حلقوں میں اسی لقب سے یاد کئے جاتے ہیں) نے اس سنت کو خوب جاری کیا اور ہزاروں

---

[1] یوں تو مشہدِ بالاکوٹ کے بعد ہی مجاہدین کا ایک گروہ سرحد پر پہنچ گیا تھا۔ اور مولانا ولایت علیؒ کے سرحد پہنچنے (۱۲۶۲ھ۔ ۱۸۴۶ء) سے پہلے وہ مختلف امرار (شیخ ولی محمد پھلتی، مولوی نصیر الدین دہلوی اور حاجی سید عبد الرحیم سورتی، اور مولانا عنایت علیؒ) کی سرکردگی میں اپنا فرض انجام دیتے رہے۔ لیکن اندرونِ ہند و بیرونِ ہند مجاہدین اور ان کے ہمدرد انہیں کو اپنا 'امیر' سمجھتے تھے، اور اسی لئے جب وہ سرحد پہنچ گئے تو 'مرابطین' نے فوراً آپ کے ہاتھ پر بیعت کرلی۔ باقی ملک کے اندر تو وہ سید صاحبؒ کی شہادت کے بعد ہی سے 'امیر' کی حیثیت سے دعوت و تبلیغ کے فرائض انجام دے رہے تھے۔

[2] مولانا ولایت علیؒ نے یہ سنت پہلے پہل خود اپنی ذات سے زندہ کی۔ مولوی الٰہی بخش صاحب جعفری صادق پوری (۱۸۶۰ء۔ ۱۲۷۵ھ) نے اپنی بیوہ لڑکی مسماۃ جمیلۃ النساء (جن کے شوہر مولوی قمر الدین جہادِ سرحد میں معرکہ بالاکوٹ سے چھ ماہ بیشتر شہید ہو چکے تھے) کا عقد آپ سے کر دیا۔ مولانا کے چھوٹے بیٹے مولوی حسن ذبیح (ف ۱۳۰۷ھ ۱۸۸۹ء) جنہوں نے سولہ سال کی عمر میں اسیرانِ بلا (۱۸۶۴ء۔ ۱۲۸۰ھ) کے مقدمات کی محیر العقول طریقہ پر پیروی کی۔ اسی بطن سے پیدا ہوئے۔ (۱۲۶۴ھ)

بیوہ عورتوں کے نکاح کرادیے۔

آپ کی ذات سے جو احیائے سنت ہوا، اس کی تفصیل کے لئے ایک دفتر چاہیئے۔ عہدِ حاضر کے "روشن خیال" حضرات کو یہ چیزیں معمولی اور حقیر معلوم ہوں گی۔ لیکن جب آپ آج سے سو برس پہلے کے حالات کا تصور کریں گے تو ان کی اہمیت معلوم ہوگی اور ان علمائے حق کی جرأت اور جذبۂ اتباعِ سنت کا صحیح اندازہ ہو سکے گا۔ اگر یہ "چیزیں" اقامتِ دین اور اعلائے کلمۃ اللہ کی دعوت سے الگ صرف جزوی اصلاح کی حیثیت سے کی جائیں، تو یقیناً زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں مگر جب اعلائے کلمۃ اللہ کی دعوت کے ساتھ اقامتِ دین کی تحریک کے ضمن میں یہ اصلاحات بھی، ہوتی جائیں تو بڑی بات ہے۔

ان بزرگوں نے یہ سنتیں آج سے ڈیڑھ سال پہلے زندہ کی تھیں اور ہمارا یہ حال ہے کہ آج بھی ہماری زندگی ہندوانہ رسم سے پاک نہیں ہو سکی ہے۔ نکاحِ بیوگان کے علاوہ اور جن سنتوں کا احیاء مولانا ولایت علیؒ کے دم قدم سے ہوا، ان کا مختصر ذکر کیا جاتا ہے:۔

۱۔ مولوی اکبر علی فرزند مولوی الٰہی بخش صاحب جعفری (ف ۱۲۷۵ھ) کا ہیضہ میں انتقال ہوا، تو ان کی بیوہ اہلیہ (بنت شاہ محمد حسین صاحب (ف ۱۲۷۶ھ) کا غائبانہ نکاح اپنے منجھلے بھائی مولوی عنایت علی صاحب غازی سے کر کے نیک بی بی کو ان کے پاس بنگال بھیج دیا۔ جہاں وہ تبلیغ و ارشاد میں مصروف تھے جیسے نجاشی (بادشاہ حبشہ) نے امام المومنین ام حبیبہؓ بنت ابوسفیان کا نکاح حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے کر کے مدینہ منورہ بھیج دیا تھا۔ (اس خاندان میں یہ دوسرا نکاحِ ثانی تھا)

۲۔ ایک شخص عبد الغنی نگر نہسوی (جو زمرۂ مساکین سے تھے) کا عقد ایک بیوہ عورت سے تعلیم قرآن مہر قرار دے کر کر دیا۔

۳۔ شرفائے بہار میں تعددِ ازواج معیوب تھا (اور آج بھی معیوب سمجھا جاتا ہے) اور ایک بیوی کے ہوتے ہوئے برابر کی جوڑ میں دوسرا نکاح کرنا تو گویا حرام سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے آپ نے اپنے خاندان میں ایسی دو شادیاں کرائیں اور ان میں تمام برادری اور عقیدتمندوں کو دعوت دے کر اتباعِ سنت کی ترغیب دی۔

۴۔ آپ نے اپنے دو صاحبزادوں مولوی عبد اللہ اور مولوی ہدایت اللہ کا عقدِ نکاح اپنے چھوٹے بھائی مولانا فرحت حسین (ف ۱۲۷۴ھ) کی دو لڑکیوں کے ساتھ اس سادگی کے ساتھ انجام دیا کہ گھر کے موجودہ کپڑے (وہ بھی پیوند لگے ہوئے) پہنا دیئے اور کوئی نیا کپڑا دلہا دلہن کے لئے تیار نہیں کرایا گیا۔ آپ نے یہ سنت بھی پانچ ہزار آدمیوں کے مجمع میں ادا کی۔

تنظیم و تبلیغ

تنظیم و تبلیغ کے سلسلے میں مندرجہ ذیل انتظامات خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں:۔

۱۔ شاہ محمد حسین صاحبؒ (ف ۱۲۷۶ھ) خلیفہ حضرت سید صاحبؒ کو مسجد نمو ہیہ (صادق پور سے متصل شہر پٹنہ کا ایک محلہ — یہ مسجد آج تک اسی خاندان کی نگرانی میں ہے) کا امام اور چھپرہ، مظفر پور اور بہار کے دوسرے اضلاع میں تلقین و ہدایت کے لئے مقرر کیا۔

۲۔ اپنے منجھلے بھائی مولانا عنایت علی غازی (ف ۱۲۷۴ھ، ۱۸۵۸ء) کو اہل بنگال کے ارشادات و ہدایت کے لئے روانہ کیا۔

۳۔ مولوی زین العابدین اور مولوی محمد عباس حیدر آبادی کو اڑیسہ اور صوبۂ الہ آباد (موجودہ یو، پی کے مشرقی اضلاع) کی طرف عام تبلیغ کے لئے بھیجا۔

۴۔ شہر پٹنہ، نواب فخر الدولہ کی مسجد میں دوسرا جمعہ قائم کیا جہاں ہر جمعہ خود وعظ فرماتے۔

۵۔ دینیات کی تعلیم کے لئے گھر پر ظہر اور عصر کے درمیان قرآن و حدیث کا درس دیتے۔ آپ کے بڑے بیٹے مولوی عبد اللہ (ف ۱۳۰۳ھ) قاری ہوتے۔ دوسرے علماء تفسیر کی کتابیں ہاتھ میں لے کر بیٹھتے۔ علماء کے علاوہ عام مریدوں اور معتقدوں کی بڑی تعداد موجود ہوتی۔ قرآن مجید اور بلوغ المرام کا لفظی ترجمہ مردوں، عورتوں اور بچوں کو پڑھواتے۔

۶۔ شاہ محمد اسحاقؒ (ف ۱۲۶۳ھ) سے شاہ عبد القادر صاحبؒ کا ترجمۂ قرآن اور مولانا شہیدؒ کے رسائل منگوا کر پہلے مطبع حسینی، لکھنؤ میں طبع کرانے کی کوشش کی۔ مالکِ مطبع کے انکار پر آپ نے یہ خدمت اپنے ایک رفیق و عقیدت مند مولوی بدیع الزماں صاحب بردوانی کے سپرد کی جنہوں نے خاص طور پر ایک ٹائپ پریس خرید کر کے پہلی مرتبہ یہ کتابیں چھپوائیں۔

تبلیغ و تذکیر کے سلسلے میں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ مولانا ولایت علیؒ کا وعظ بہت پُر اثر ہوتا تھا۔ نواب صدیق حسن خاں (ف ۱۳۰۷ھ) نے ان کے قنوج آنے اور وعظ کی تاثیر کا خاص طور پر ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ انھوں نے "بلوغ المرام" کی شرح مولانا ہی کی ترغیب سے لکھی تھی۔ نواب صاحبؒ فرماتے ہیں۔

پھر مولوی ولایت علی، مولوی عنایت علی قنوج میں تشریف لائے۔ میرے مکان پر آئے۔ اپنے اہلِ بیت کو واسطے ملاقات والدۂ مرحومہ کے پاس بھیجا۔ جامع مسجد قنوج میں چند جمعہ تک وعظ کہا۔ مجھ سے کہہ گئے کہ تم کتاب بلوغ المرام ضرور پڑھنا۔ میں اس وقت بارہ تیرہ برس کا ہوں گا۔ اُس کہنے کا نتیجہ بعد ایک مدت دراز کے یہ ظاہر ہوا کہ میں نے بلوغ المرام کی شرح لکھی جو اثرِ سریع میں نے وعظ مولوی عنایت علی مرحوم میں پایا وہ کسی میں نہ دیکھا نہ سنا۔ ان کے پاس بیٹھنے سے دل دنیا سے سرد ہو جاتا تھا اور دین کا جوش تہِ دل سے اٹھتا تھا۔ یہ مصرعہ میں نے انہیں سے یاد کر لیا تھا۔ ع

ہم طرزِ جنوں اور ہی ایجاد کریں گے[1]

حج و جہاد

مولانا ولایت علی خود بھی بنگال تشریف لے گئے۔ شہروں اور دیہاتوں کا دورہ کیا۔ پھر اپنے مرشد و امیر کی اتباع میں آغازِ جہاد سے پہلے حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے اور اسی سلسلے میں یمن اور دوسرے مقامات کی سیاحت کی اور یمن کے نامور محدث و عالم قاضی محمد بن علی شوکانیؒ (ف ۱۲۵۰ھ) سے حدیث کی سند حاصل کی اور ان کی[2] بعض تصانیف ساتھ لائے۔ ان کی یہی ادا ہمارے مولانا سندھیؒ کو ایک آنکھ نہیں بھاتی[3]۔ پتہ نہیں، بیرونِ ہند کے کسی عالم اور محدث سے استفادہ کیوں جرم

---

[1] ابقاء المنن بالقاء المحن: ص ۱۲

[2] الدرر البہیہ کا وہ نسخہ جو مولانا ولایت علیؒ یمن سے ساتھ لائے تھے، اب تک صادق پور میں محفوظ ہے اور راقم الحروف کی نظر سے گذر چکا ہے۔

[3] ملاحظہ ہو: مولانا سندھی اور ان کے افکار و خیالات پر ایک نظر۔ ص ۸۸-۸۷

قرار دیا جاتا ہے ؟ اسلام تو اس قسم کی ملکی اور وطنی حد بندی کا قائل نہیں۔
واپسی کے بعد اپنے سگے بھائی مولانا عنایت علی غازی رح کو سید ضامن شاہ (جو کاغان کے رہنے والے اور اُن دنوں سکھوں سے برسرِ پیکار تھے) کی طلب پر مقامِ جہاد کی طرف روانہ کیا۔ پھر خود بالاکوٹ پہنچے اور مجاہدین کی کمان اپنے ہاتھ میں لے لی۔[1]
اس وقت کشمیر کے راجہ گلاب سنگھ اور مجاہدین کے درمیان جنگ جاری تھی۔ راجہ کو شکست ہوئی اور اس نے انگریزوں کے سائے میں جاکر پناہ لی۔[2] جو اس وقت تک پنجاب کے

---

[1] ایک نادر قلمی رسالے میں جو ذیقعدہ ۱۲۶۲ھ (۱۸۴۶ء) کو میدانِ جہاد سے بھیجا گیا ہے، مولانا ولایت علی رح کے موقع پر پہنچنے کا حال ان الفاظ میں درج ہے:-
"الحمد للہ علیٰ احسانہ وکمال منہ وکرمہ کہ بتاریخ ہفدہم شہر شوال روز جمعہ ۱۲۶۲ھ۔ جناب حضرت مولانا ..... منظہر کرامات لم یزلی ..... مرشدنا و امیرنا مولوی ولایت علی صاحب ادام اللہ برکاتہٗ وانوارہ ..... مع تمام اہلِ قافلہ وآلات واسباب وخیل ..... محض از فضل رب الارباب از میانِ ہجوم اعدار بحکومت اہل اسلام جلوہ افروز شدند"۔

[2] صورت حال کے سمجھنے کے لئے مندرجہ ذیل امور کا ذہن میں رکھنا ضروری ہے:-
(الف) گلاب سنگھ سکھوں کے ماتحت صرف جموں کا گورنر تھا۔ کشمیر کی گورنری امام الدین کے سپرد تھی اور بالائی ہزارہ اس زمانہ میں کشمیر کے ماتحت تھا۔
(ب) جب تک سکھ برسرِ اقتدار رہے، مجاہدین کی لڑائیاں ان سے ہوتی رہیں۔
(ج) رنجیت سنگھ کی وفات (۱۸۳۹ء) کے بعد سکھ حکومت خانہ جنگی کے باعث کمزور ہوگئی تو خوانینِ ہزارہ اور مجاہدین نے شمالی ہزارہ کے بڑے حصے پر قبضہ جما لیا۔
(د) نومبر ۱۸۴۵ء میں انگریزوں اور سکھوں کی پہلی جنگ ہوئی۔ اس میں مجاہدین اور خوانین کو مزید استحکام کا موقع ملا۔
(ہ) گلاب سنگھ اس جنگ میں الگ رہا تھا اس لئے جنگی خرچ لے کر جموں کے علاوہ کشمیر بھی اسے دے دیا گیا۔ اس کے بعد مجاہدین کو براہِ راست انگریزوں سے سابقہ پڑا۔

ا[ن] [مف]توحہ حصّے پر قابض اور ملکی معاملات میں پوری طرح دخیل ہو چکے تھے۔ (۱۸۴۷ء تا دو برس بعد ۱۸۴۹ء) پھر جنگ ہوئی اور نہ صرف پنجاب بلکہ سکھوں کا پورا مقبوضہ انگریزی عملداری میں آگیا۔)

حکومت نے مولانا ولایت علی کو اطلاع دی کہ اب گلاب سنگھ پر حملہ کرنا خود انگریزی حکومت سے لڑائی مول لینا ہے۔ حکومت کی پالیسی یہ تھی کہ جب تک ان پر براہِ راست زد نہ پڑے، مجاہدین سے ٹکر نہ لی جائے اور انہیں سکھوں سے لڑنے دیا جائے۔ مجاہدین اور سکھوں میں سے جس کی بھی شکست ہو سرکار انگریزی کا بہرحال فائدہ تھا۔

اسی لئے شروع شروع مجاہدین سے روک ٹوک نہیں کی گئی۔ لیکن جب پنجاب کا بڑا حصّہ انگریزوں کے قبضے میں آگیا تو مجاہدین حکومت کی نگاہوں میں کھٹکنے لگے۔ مجاہدین بھی خواہ مخواہ حکومت سے نبرد آزما ہونا خلافِ مصلحت خیال کرتے تھے۔ کوئی فریق ایک دوسرے سے مطمئن نہیں تھا کہ گلاب سنگھ کے سلسلے میں حکومت نے دھمکی دی۔ ابھی گفت وشنید کا سلسلہ جاری تھا کہ جاسوسوں نے باشندوں کو بھڑکایا۔ اور انھوں نے مجاہدین کے ساتھ شرمناک غداری کی ایک روز مقرر کر کے سارے علاقے میں ان غریب الوطن "مہاجروں"[1] کا قتلِ عام کرادیا اور سید ضامن شاہ (جس کی درخواست پر مولانا عنایت علی کو بھیجا گیا تھا اور جس کی تمام جائداد مجاہدین کی امداد واعانت سے واپس مل چکی تھی) نے بھی بے وفائی کا ثبوت دیا۔ اس کے بعد مولانا نے صوات نیر کا رُخ کرنا چاہا مگر سرکار انگریزی[2] مزاحم ہوئی۔ ناچار حکومت کے پیدا کردہ حالات سے مجبور ہو کر اپنے بھائی اور

---

[1] یہ تذکرۂ صادقہ کی روایت ہے ص ۱۲۲، ۱۳۵ مگر اس غداری اور قتلِ عام کا ثبوت اور کہیں نہیں ملتا۔

[2] مولوی عبدالرحیم صاحب نے "تذکرۂ صادقہ" میں اس 'مزاحمت' کی تفصیل نہیں کی۔ سرکاری دستاویزوں سے معلوم ہوتا ہے کہ سکھوں کے بعد درۂ ڈب DOOB کے مقام پر مجاہدین اور انگریزی فوج کے درمیان بھی لڑائی ہوئی جس میں مجاہدین کو شکست ہوئی اور یہ دونوں بھائی گرفتار کر کے حراست میں پٹنہ بھیج دیے گئے۔ انگریزی فوج کی کمان جنرل ایبٹ ABBOT کے ہاتھ میں تھی۔ (ص ۱۰)

خاص رفیقوں کے ساتھ انھوں نے وطن کی راہ لی۔ پھر بھی ان کے ساتھیوں کی ایک بڑی تعداد میر اولاد علی (ف ۱۲۷۱ھ، ۱۸۵۵ء) ساکن سورج گڈھا[۱] ضلع مونگیر کی قیادت میں خفیہ طریقے پر ستھانہ پہنچ گئی۔ واپسی پر دونوں بھائیوں کو پٹنہ کے مجسٹریٹ کے روبرو حاضر ہو کر دو سال کے لئے مچلکہ دینا پڑا۔[۲]

مولانا ولایت علیؒ دو سال تک وطن میں رہ کر تبلیغ و تذکیر کرتے رہے۔ مختلف علاقوں میں خاص مبلّغ بھیجے۔ اپنے منجھلے بھائی مولانا عنایت علی غازیؒ کو پھر بنگال بھیجا۔ اور تمام مشاغل اس طرح جاری کر دیے کہ عام طور پر یہ خیال کیا جانے لگا کہ اب مولانا سرحد کا رُخ نہیں کریں گے۔ حکومت بھی مطمئن ہو گئی کہ پورے دو سال قیام کے بعد یک بیک آپ تے چند مخلصوں کے ساتھ خفیہ صوات بنیر کی راہ لی۔ پورب اور بنگال کے دیہاتوں میں ان کے مبلّغ موجود تھے، جو لوگوں کو جہاد کی ترغیب دیتے اور مجاہدین کے مصارف کے لئے مال جمع کرتے۔ اور اللہ تعالیٰ انھیں مختصر "تبرعات" میں بڑی برکت دیتا۔

وہاں پہنچنے کے بعد غالباً سال ڈیڑھ[۳] سال سے زیادہ عمر نے مساعدت نہ کی۔ یہ پوری مدت جہاد کی تیاریوں میں گذری، مگر ابھی قتال و جدال کا سلسلہ شروع نہیں ہونے پایا تھا کہ رحمتِ الٰہی نے یاد کیا۔ سرحد کی سرزمین پسند آئی اور وہیں رہ گئے۔ مولانا ولایت علی کا انتقال سید صاحبؒ کی شہادت کے ۲۲ سال بعد اور ہنگامہ ۵۷ء (۱۲۷۳ھ) سے چار پانچ سال پہلے (محرم ۱۲۶۹ھ م اکتوبر ۱۸۵۲ء) میں ہوا۔ اللہ تعالیٰ اس مہاجر و

۱؎ اسی سورج گڈھا کو مشہور محدث میاں صاحب سید نذیر حسین صاحب دہلوی (ف ۱۳۲۰ھ) کے مرز بوم ہونے کا شرف حاصل ہے۔

۲؎ اس مچلکہ کی تاریخ ۲۳ جولائی ۱۸۴۷ء سرکاری کاغذات میں ملتی ہے۔ پٹنہ کے مشہور فرم امیر خاں و حشمداد خاں کے شریک حشمداد خاں اور دلاور خاں کی ذاتی ضمانت تھی۔ جس کی پاداش میں یہ لوگ بھی بعد کو مصیبتوں کا نشانہ بنے اور ان کا فرم تباہ کر دیا گیا۔ (۱۸۶۴ء) ان کے ابتلا کا ذکر آگے آتا ہے۔

۳؎ ملاحظہ ہو: حاشیہ، ص ۶۱

مُرابط کی تربت پر اپنے انوارِ رحمت کی بارش فرمائے۔ آمین

مولانا عنایت علی غازیؒ

مولانا ولایت علی صاحبؒ کے بعد اُن کے منجھلے بھائی مولانا عنایت علی غازیؒ مجاہدین کے امیر تسلیم کئے گئے۔ (۱۲۶۹ھ، ۱۸۵۲ء) یوں تو یہ شروع سے آخر تک اپنے بھائی کے ساتھ اور اُن کے تمام کاموں میں دست و بازو بنے رہے۔ مگر ان کا مزاج اور طبیعت کا رنگ جُدا تھا۔ اُن پر تیزی اور شجاعت غالب تھی۔ سید صاحب سے بیعت (۱۲۳۹ھ) کے بعد ایک منٹ کے لئے بھی کبھی آرام نہیں کیا۔ پہلے اپنے امیر و مرشد حضرت سید شہیدؒ کے احکام کے مطابق تبلیغ و جہاد میں مصروف رہے۔ امیرؒ کی شہادت کے بعد اپنے بڑے بھائی مولانا ولایت علیؒ کے مشوروں اور ہدایت کے مطابق اعلاء کلمۃ اللہ کی خدمت انجام دیتے رہے۔

تبلیغ اپنے شیخ کے ساتھ یہ بھی میدانِ جہاد میں شریک تھے کہ انہیں مولانا شہیدؒ دہلوی کے مشورے سے نواح دہلی کی طرف ان غلط فہمیوں کے سدِ باب کے لئے روانہ کیا گیا۔ جو بعض مدعیانِ علم نے مجاہدین کے متعلق ان اطراف میں پھیلا رکھی تھیں[۱]۔ اسی دوران میں بالاکوٹ کا دردناک واقعہ پیش آیا اور آپ وطن لوٹ آئے۔ جب مولانا ولایت علیؒ نے دکن سے واپس آکر جماعت کی از سرِ نو تنظیم شروع کی تو آپ کو بنگال کی طرف روانہ کیا' جہاں آپ نے پہلی بار سات برس مسلسل نہایت جانفشانی اور بردباری کے ساتھ گاؤں گاؤں کا دَورہ کیا اور یہ انہیں "دَوروں" کا اثر تھا کہ بنگال کی سرزمین تیس چالیس برس تک مجاہدینِ سرحد کے لئے آدمی اور روپے فراہم کرتی رہی۔

پہلا دَورہ سات برس (یا اس سے بھی کچھ زیادہ[۲] عرصہ تک) جاری رہا۔ پھر آپ سید

---

[۱] تذکرہ صادقہ: ص ۱۳۳ ' نیز سیرت سید احمد شہیدؒ: طبع دوم ص ۱۹۲-۱۹۰

ایک صاحبِ علم اس بات کا یقین دلاتے ہیں کہ "مولانا عنایت علیؒ کو نواحِ دہلی کی طرف کبھی نہیں بھیجا گیا اور ان کا دائرہ عمل ہمیشہ بنگال ہی رہا۔" افسوس کہ نظرثانی کے دوران میں راقم اسکی مزید تحقیق نہ کرسکا

[۲] صاحبِ تذکرۂ صادقہ نے "سات برس" لکھاہے' مگر یہ نہیں بتاتے کہ ۱۸۳۹ء اور ۱۸۴۴ء کے درمیان وہ کس مہم میں مصروف رہے۔؟

امن شاہ رئیس کاغان کی مدد کے لئے میدانِ جہاد پہنچ گئے (۱۸۴۴ء) جہاں آپ ایک
رت تک راجہ گلاب سنگھ والئ کشمیر سے برسرِ پیکار رہے، پھر جب "بڑے حضرت"
مولانا ولایت علی صاحبؒ) نے خود پہنچ کر زمامِ قیادت اپنے ہاتھ میں لے لی، تو آپ انکی
ماتحتی میں ڈیڑھ برس اور مصروفِ قتال رہے۔ یہ معرکہ آرائیاں بار آور رہی تھیں
کہ گلاب سنگھ اور سرکار انگریزی کی صلح ہوگئی۔ پھر درہ ڈب کے مقام پر مجاہدین کو
انگریزوں کے مقابلے میں شکست ہوئی اور مولانا عنایت علیؒ اپنے بڑے بھائی کے ساتھ
پٹنہ واپسی پر مجبور ہوئے (۱۸۴۷ء) جس کی تفصیل اوپر آچکی ہے۔ مگر اس مردِ غازی کو چین
کہاں؟ مولانا عنایت علیؒ کو بجا طور پر "غازی" کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ سید صاحبؒ
سے بیعت کے بعد (۱۲۳۹ھ) اپنے آخری لمحۂ حیات (۱۲۷۴ھ، ۱۸۵۸ء) تک انہیں ایک دن
بھی اہلِ دنیا کی طرح آرام کی نیند نصیب نہیں ہوئی۔ بالاکوٹ سے لوٹے، تو پھر بنگال کا رخ کیا
اور پھر تین چار سال تک مسلسل اس خطے میں جہاد و احیائے سنت کی تبلیغ کرتے رہے۔ یہ
آپ کا دوسرا تبلیغی دورہ تھا۔ اس کے بعد جب تیسری مرتبہ سرحد کو گئے (۱۸۵۱ء) تو وہیں
کے ہو رہے جس کا تذکرہ آگے آتا ہے۔

تبلیغی دوروں میں ان کا مستقر صوبہ بنگال کے ضلع جسور (JESSORE) میں حاکم پور[1]
نامی ایک گاؤں ہوتا۔ جب سفر کی صعوبتوں سے خستہ ہو جاتے تو وہیں حاجی مفید الدین صاحب
کے گھر پر آرام فرماتے۔ آپ کی دوسری اہلیہ (جنہیں غائبانہ ایجاب و قبول کرا کے آپ کے
پاس بھیج دیا گیا تھا) وہیں رہتیں۔ مگر یہ وقفہ بھی بے عملی کا نہ ہوتا۔ بلکہ اس اثناء میں حاکم پور
اور اس کے نواح کے مسلمان ہزاروں کی تعداد میں آکر آپ کی صحبت اور مواعظ سے فائدہ
اٹھاتے۔

فصل خصومات آپ کی تبلیغ کے سلسلے میں پنچایت اور فصلِ خصومات کا نظم خاص
طور پر قابلِ ذکر ہے۔ طاغوتی عدالتوں سے اجتناب کوئی نئی چیز

---

[1] پٹنہ کے مجسٹریٹ، ٹی راونشا کے میمورنڈم (۱۸۶۵ء) میں حاکم پور کا نام ضلع بزت (بنگال)
میں آتا ہے۔

نہیں۔ اہلِ حق ہمیشہ سے "تحاکم الی الطاغوت" سے بچتے رہے ہیں اور آخر قرآن مجید میں جس چیز کے انکار اور جس سے کھلم کھلا بیزاری کا حکم دیا گیا ہے اس سے اہلِ حق تعاون کس طرح کر سکتے ہیں؟ آپ کو یہ سُن کر خوشی ہو گی کہ سید شہید رح کے متبعین بھی اس پر خاص زور دیتے تھے۔ اچھا ہو گا کہ آپ یہ تذکرہ خود مولانا عبدالرحیمؒ صادق پور (مولود ۱۲۵۲ھ ف ۱۳۴۱ھ) مؤلفِ "تذکرہ صادقہ" کی زبانی سُنیں:۔

"لوگوں کے اصلاحِ حال اور فیصلۂ طاغوتی سے بچنے کے لئے ضرورت تھی کہ جہاں لوگوں کو فساد و فتن سے روکا جائے، وہاں ان میں عدل و تصفیح کی روح پھونکی جائے، اور ان کے ناگزیر تنازع اور پیچیدہ مسائل کے محاکمہ اور فیصل کے لئے کوئی صورت قائم کر دی جائے۔ اور ساتھ ہی ساتھ شاورہم فی الامر کی سنت بھی ادا ہو سکے۔ چنانچہ جناب ہر ایک بستی میں جہاں مسجد موجود ہوتی وہاں امام مقرر کرتے (اور جہاں مسجد نہ ہوتی وہاں مسجد بھی تعمیر کرا دیتے) اور فصل خصومات کا بار اسی کے "شانہ" پر رکھتے۔ چار پانچ کوس کے حلقے میں کسی بڑی مسجد کو جامع مسجد قرار دے کر ایک تعلیم یافتہ متدین امام کے سپرد کر دیتے اور امام "بمنزلہ سشن جج" متصور ہوتا۔ اگر اس پر بھی لوگوں کی تسکین خاطر نہ ہوتی تو متخاصمین کی اس اپیل پر بذاتِ خود ان مقامات پر پہنچتے، فصلِ تنازع فرماتے اور ملفوظات کیمیا اثر سے تالیفِ قلوب فرماتے۔[۱]

جہاد مولانا عنایت علی غازی رح کی صحیح جگہ میدانِ جنگ تھی اور یہیں ان کے حقیقی جوہر کھلتے تھے۔ ان کے جہاد کے چار دَور ہیں:۔

۱۔ پہلا دور سید صاحبؒ کی معیت میں، جب تک وہ وہاں سے ایک دوسری مہم پر نہ بھیج دیے گئے۔

۲۔ دوسرا دَور مشہد بالا کوٹ کے تقریباً تیرہ برس بعد شروع ہوتا ہے، جب وہ سید ضامن شاہ کی درخواست پر اپنے بڑے بھائی مولانا عنایت علیؒ کے حکم سے بالا کوٹ گئے۔ (۱۸۴۴ء) یہ جنگ ساڑھے چار برس جاری رہی۔ یوں تو اپنے جارحانہ حملوں سے آپ نے

۱۔ ص ۱۳۴

شروع ہی میں ضامن شاہ کے قلعے، کل علاقے اور مورچے واپس دلا دئے تھے۔ مگر گلاب سنگھ کے مکروفریب اور مقامی ہمدردوں[1] کی غداری نے مجاہدین کو تتر بتر کر دیا اور وہ سرکار انگریزی کی شرطوں کے موافق وطن لوٹنے پر مجبور ہوئے۔

مولانا ولایت علیؒ کے پہنچنے سے پہلے، مولانا عنایت علیؒ نے راجہ گلاب سنگھ کو جو شکستیں دیں اور سید ضامن شاہ رئیس کاغان کے جو مقبوضات واپس لے لئے ان کے متعلق مولوی عبدالرحیم صاحب کا مختصر اور محتاط بیان یہ ہے :-

"بڑے بڑے معرکے سر کئے اور ظفریاب ہوئے جن سے کفار و منافقین کے دل ہار گئے۔ سکھوں سے متعدد مورچے، قلعے، علاقہ جات چھین لئے، خوانین غدار اور سرکش کو بھی مطیع و فرمانبردار کر لیا۔ تمام امن و طمانیت بخش کر کلمۂ توحید کی منادی کر دی اور حدود و قصاص اسلامی جاری کر دیئے۔"[2]

اس کی تفصیل اس قلمی رسالہ یا "اعلام نامہ" (مورخہ ذیقعدہ ۱۲۶۲ھ، ۱۸۴۶ء) میں مذکور ہے جو میدانِ جہاد سے ہندوستانی مجاہدین نے اپنے اہلِ ملت و وطن کے نام ارسال کیا تھا۔

۳۔ جب مولانا ولایت علی مستقل طور پر سرحد کو ہجرت کر گئے اور تقریباً ڈیڑھ برس[3]

---

[1] صاحبِ 'تذکرہ صادقہ' کی روایت کے مطابق۔

[2] تذکرہ صادقہ۔ ص ۱۳۵ "مورچے" پر یہ حاشیہ بھی درج ہے :-

"ملک چھچھ و پکھلی مع قلعہ جات ڈب۔ مظفر آباد۔ کل اٹھارہ مورچے۔"

[3] تاریخوں میں بڑا اختلاف ہے۔ مولوی عبدالرحیم صاحب (ف ۱۳۴۱ھ) نے انڈمان سے واپسی کے بعد تذکرہ صادقہ، لکھی اور اس حال میں کہ ان پر سرکار کی نظرِ عنایت قائم تھی۔ بیچاروں نے بہت بچ بچ کر لکھا ہے۔ سرکاری رپورٹوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آخری مرتبہ سرحد پر مولانا ولایت علیؒ صرف ایک سال زندہ رہے... (وہابی ٹرائل۔ ص ۱۵۶، ۱۰۱) تذکرہ صادقہ میں۔ ص ۱۲۸ — "تین چار برس قیام کے بعد" وفات کا ذکر آتا ہے۔ بہر حال سنہ وفات میں اختلاف نہیں۔ راونشا کا ایک بیان یہ ہے کہ دوسری مرتبہ ۲۱ مئی ۱۸۵۱ء (رجب ۱۲۶۷ھ) کو

قیام کے بعد وہیں ان کا انتقال ہوگیا (ماہ محرم ۱۲۶۹ھ، ۱۸۵۲ء) یہ زمانہ جہاد کی تیاریوں میں گذرا اور کوئی خاص جنگ نہ ہوسکی۔ مولانا عنایت علیؒ مزاج کے تیز تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ کچھ ہونا چاہیئے۔ جہاندادخاں والی انب سے اس کی شرارت کے باعث آپ نے چھیڑ چھاڑ کرنا چاہی، مگر مولانا ولایت علیؒ نے بعض مصالح کے باعث اس کو منظور نہیں کیا۔ یہ بات گرم مزاج غازیؒ کو ناگوار معلوم ہوئی اور وہ تین چار سو آدمیوں کے ساتھ، بڑے بھائی سے علیحدہ ہوکر منگل تھانہ سید عباس کے پاس جارہے، اور ان کی املاک و فوج کی نہایت خلوص اور ہوشیاری کے ساتھ نگہداشت کی۔

۴۔ مولانا ولایت علیؒ کے انتقال کے بعد آپ منگل تھانہ سے ستھانہ (مجاہدین کا بڑا مستقر) واپس آئے اور تمام لوگوں نے آپ کے ہاتھ پر بیعتِ امارت کی (۱۲۶۹ھ، ۱۸۵۲ء) اس وقت جنگ کے دو محافظ تھے۔ ایک ستھانہ اور دوسرا نارنجی اور منگل تھانہ — مولانا عنایت علیؒ پہلے نارنجی میں ٹھہرے، پھر منگل تھانہ میں۔ وہاں مجاہدین کو شکست ہوئی تو آپ نے ستھانہ کا قصد کیا، لیکن راستہ ہی میں پیامِ اجل آپہنچا۔ اس آخری دَور میں جو لڑائیاں ہوئیں یا جن مصائب کا آپ کو سامنا کرنا پڑا، اُن کی تفصیل آگے آتی ہے۔

یہاں صاحبِ تذکرہ صادقہ کے ایک بیان کی توضیح بلکہ تردید مقصود ہے۔ مولانا عبدالرحیم نے سید اکبر شاہ (امیرِ صوات) اور ان کی اولاد (سید مبارک، سید عمر، سید عمران، سید مدار) پر بے وفائی کا الزام عائد کیا ہے، جو واقعات سے صحیح نہیں ثابت ہوتا۔ عجیب تر

ولایت علیؒ سرحد پر پائے گئے (کلکتہ گزٹ۔ ص ۱۶۱) اس طرح پر گویا ڈیڑھ سال کے بعد وفات ہوئی۔ اور یہی قرینِ قیاس ہے۔ تذکرہ صادقہ کی روایت "تین چار برس" قیام کی صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ ۱۸۴۷ء میں واپسی اور ۱۸۵۲ء میں وفات متعین ہے۔ پھر تذکرہ صادقہ میں واپسی کے بعد پٹنہ میں دو برس قیام کی بھی تصریح ہے۔ نیز یہ بھی درج ہے کہ پٹنہ سے دہلی تک کا سفر ڈیڑھ برس میں طے ہوا تھا (ص ۱۲۶) پھر قیام سرحد کی مدت تین چار برس کس طرح ہوسکتی ہے؟ بعض دوسرے مآخذ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ مئی ۱۸۵۱ء کے لگ بھگ سرحد پر دیکھے گئے (ہنٹر: ص ۱۴۱، حاشیہ)

بات یہ ہے کہ ان میں صرف سید مبارک شاہ، سید اکبر شاہ کے بیٹے تھے اور سید عمر وغیرہ ان کے بھائی تھے۔ ان کے بھائی اور بیٹے سید مبارک شاہ، سب کے سب آخر دم تک مجاہدین کے معاون[1] و مددگار رہے اور اس سلسلے میں ہر قسم کی قربانیاں برداشت کیں۔

اس وقت خود سید اکبر شاہ زندہ تھے۔ ان کی وفات ۱۸۵۷ء، عین ہنگامہ کے دوران ہوئی۔[2] ان کی موجودگی میں ان کے بیٹے اور بھائیوں کے اختیارات ہی کیا تھے؟ جو وہ بے وفائی یا غداری کی جرأت کرتے۔

غداروں پر اعتماد

مجاہدین کے ابتلاء و مصائب کی تفصیل سے پیشتر یہ عرض کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ سرحد اور خوانین کی غداری اور بے وفائی کے باعث ان مجاہدینِ راہِ حق کو بار بار سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ خود حضرت سید شہید رح کو سردارانِ پشاور کی غداری نے جس قدر اذیت پہنچائی، وہ سب کو معلوم ہے، مگر یہ غداری اور خیانت ختم نہیں ہوئی، اور حیرت یہ ہے کہ یہ مجاہدین بھی برابر ان غداروں پر اعتماد کرتے رہے۔ حالانکہ مومن کی علامت یہ بتلائی گئی ہے کہ وہ ایک سوراخ سے دو بار نہیں ڈسا جاتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہندوستانی مجاہدین سید صاحب رح کی غیبوبیت اور دوبارہ ظہور کے توقع پر ان غداریوں کو برداشت کرتے رہے۔ یہ سب سے بڑی غلطی تھی جو ان "مجاہدین" نے اس سلسلے میں روا رکھی۔ بہرحال ہم اس پر آگے چل کر مزید روشنی ڈالنے کی کوشش کریں گے۔ سردست خوانین کی غداری کے متعلق ایک باخبر اور "مبتلائے الم" ہستی کے تاثرات نذرِ ناظرین ہیں۔

---

[1] ہنٹر نے لکھا ہے کہ اِن دنوں (۱۸۷۰ء) وہ ستھانہ کے مجاہدین کا لیڈر ہے۔ ص ۱۱

[2] انڈین مسلمانز: ص ۱۱، ایک صاحبِ علم نے صحیح تاریخِ وفات ۱۱ر مئی ۱۸۵۷ء بتائی ہے۔ وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ "ساداتِ ستھانہ کی قربانیاں مجاہدین صادق پور سے کسی حال میں کم نہ تھیں۔" واللہ اعلم بالصواب۔

اس زمانے میں پنجاب و نواح پنجاب متعدد خوانین کے زیرِ حکومت[1] تھا۔ گویا ہر ایک تعلقدار آزاد بادہ تھا۔ یہ آپس میں تیغ آزمائی کرتے۔ حرکاتِ شنیعہ کا بے غیرتی کے ساتھ ارتکاب کرتے۔ اخلاق و حمیت سے عریاں تھے۔ غداری، خودغرضی اور نفاق ان کا طرۂ امتیاز تھا۔ حلاوتِ ایمانی سے آشنا تک نہ تھے۔ اس حالتِ زبوں سے سکھوں کو انہیں ستانے کی جرأت ہوتی اور ان کے آپس میں خوب بھینڈے لڑا دیتے۔ جب وہ اپنی قوت آزمائی سے عاجز آجاتے تو حالت اضطراری میں برکاتِ مجاہدین یاد آجاتیں اور نہایت لجاجت کے ساتھ ایک بے نوا کی طرح اعانت و نصرت کی درخواست کرتے اور پھر اثنارِ معرکہ میں یا خیر انجام پر دشمنوں کے تملق سے شرمناک بدعہدی کرتے۔[2]

یہ تاثرات ہیں مولوی عبدالرحیم صاحب[3] صادق پوری ابن مولانا فرحت حسین صاحب (ف ۱۲۷۴ھ) کے جو اپنے دونوں چچا مولانا ولایت علیؒ اور مولانا عنایت علیؒ کی "سرگرمیوں" میں کمسنی ہی سے شریک تھے۔

چھیڑ چھاڑ ۱۸۵۲ء تا ۱۸۵۷ء

یہ ہم ابھی لکھ آئے ہیں کہ مولانا عنایت علیؒ کی جہادی سرگرمیوں کا چوتھا دور مولانا ولایت علیؒ کے انتقال کے بعد شروع ہوتا ہے (محرم ۱۲۶۹ھ، ۱۹۵۲ء) یہ بھی پہلے گذر چکا ہے کہ وہ انگریزوں کے حلیف والی انب پر حملہ کرنا چاہتے تھے مگر مولانا ولایت علیؒ نے اجازت نہ دی۔ جب زمامِ قیادت ان کے ہاتھ میں آئی تو ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ جہاں داد خاں والی انب سے "ٹکر" ناگزیر ہو گئی۔

---

[1] پنجاب کے متعلق یہ بیان صحیح نہیں۔ وہاں کبھی بھی قبائلی حکومت نہیں تھی۔ البتہ سرحدی علاقے میں بعض خوانین کا اقتدار تھا۔

[2] تذکرہ صادقہ: ص ۱۳۶-۱۳۵

[3] مولانا عبدالرحیم صاحب صادق پوری (ف ۱۳۴۱ھ) کے متعلق والد ماجد مولانا حکیم محمد عبدالشکور صاحب مدظلہٗ (مولود ۱۲۹۰ھ) ایک مرتبہ فرماتے تھے کہ "ان کو دیکھ کر صحابہ کرامؓ کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔"

۱۸۵۲ء اور ۱۸۵۷ء کے درمیان مجاہدین اور سرکارِ برطانیہ کے درمیان جو "کشمکش" جاری رہی، اس کا مختصر بیان درج ذیل ہے :-

"۱۸۵۲ء میں ان کا منصوبہ مکمل ہو چکا تھا۔ ستھانہ کیمپ میں برطانوی علاقے سے آدمی اور روپے کی آمد برابر جاری تھی اور ہماری فوج سے ان کی باغیانہ خط و کتابت بھی پکڑی گئی تھی۔ ان مجاہدین نے بڑی چالاکی سے یہ چاہا تھا۔ ہماری چوتھی دیسی سپاہ، متعینہ راولپنڈی کی وفاداری داغدار ہو جائے۔

برطانوی حکومت اب زیادہ دیر تک حقائق سے آنکھ نہیں بند کر سکتی تھی۔ ۱۸۵۳ء کے موسم بہار میں "ایک سرحدی جنگ (FRONTIER WAR) کی تجویز زیرِ غور آ چکی تھی"۔ اسی سال ان لوگوں نے ہمارے حلیف ریاست، امب کے سردار پر حملہ کیا، جس سے برطانوی حکومت ایک فوج بھیجنے پر مجبور ہوئی۔"

"۱۸۵۳ء میں ہماری فوج کے متعدد افراد[1] "باغیوں" خط و کتابت کے الزام میں ماخوذ اور سزایاب ہوئے۔"

"میں یہاں ان زیادتیوں، توہین اور قتل کے واقعات کی تفصیل نہیں کرنا چاہتا، جو ۱۸۵۸ء جنگ سرحد کا باعث ہوئیں۔ اس پوری مدت میں (۱۸۵۷ء - ۱۸۵۲ء) مجاہدین نے سرحدی قبائل کو برطانوی حکومت کے خلاف برسرِ پیکار رکھنے کی کوشش کی۔[2]"

اس واقعے کے متعلق مجاہدین کے سب سے بڑے کرم فرما اور ہنٹر صاحب کے پیر و مرشد جناب راونشا RAVENSHAW کلکٹر پٹنہ (۱۸۶۵ء) اپنے مشہور میمورنڈم میں تحریر

---

[1] راونشا نے ان میں سے ایک کا نام محمد ولی 'رجمینٹ منشی' بتایا ہے۔

[2] دی انڈین مسلمانز۔ ص ۱۵-۱۴

فرماتے ہیں :۔

۱۸۵۲ء کے ریکارڈ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان مذہبی دیوانوں نے ہمارے حلیف جہاں داد خاں والی انب پر حملہ کیا۔ جس کے باعث آگے چل کر ۱۸۵۸ء میں ضروری ہو گیا کہ سر سڈنی کاٹن کی سرکردگی میں ان کے خلاف ایک مہم بھیجی جائے۔[1]

اس سلسلے میں ہنٹر صاحب کی مزید توضیح ملاحظہ ہو :۔

"ایک معمولی واقعے سے صورت حال کی نزاکت کا احساس ہو گا ۱۸۵۰ء، ۱۸۵۷ء کے درمیان ہمیں مختلف وقتوں میں سولہ مہم (ENPEDITIONS) جاری کرنا پڑی، جن میں ۳۳... تربیت یافتہ فوج سے کام لیا گیا۔ اس دوران میں ستھانہ کی نو آبادی کو سرحد کے طول و عرض میں جہاد کی روح بھڑکاتی رہی، پھر بھی ہماری فوج سے راست ٹکر نہ لیکر انھوں نے عقلمندی کا ثبوت دیا۔[2]

آخری ابتلاء ۱۸۵۷ء، ۱۸۵۸ء

غالباً اوپر کے بیانات سے یہ اندازہ ہوا ہو گا کہ مجاہدین کے ہم خیال و ہم مشرب اصحاب بہار و بنگال میں خفیہ طور پر چندے کر کے سرحد بھیجتے تھے اور بیرونِ ہند کی امارت کی تائید کے لئے اندرونِ ہند میں بھی ان کا خاص نظام تھا۔ (جس کی ضروری تفصیل آگے آئے گی) یہ سلسلہ برابر جاری رہا اور سارا "کام" حسن و خوبی کے ساتھ چلتا رہا کہ اسی دوران میں ۵۷ء کا پر آشوب حادثہ پیش آیا اور گو مجاہدین[3] اور ان کے معاونین ایک دینی نظام سے وابستہ

---

[1] راونشا کا میمورنڈم، مندرجہ کلکتہ گزٹ (ضمیمہ ۲ر ستمبر ۱۸۶۵ء)

[2] دی انڈین مسلمانز : ص ۱۶-۱۵

[3] ایک صاحب علم نے اس طرف توجہ دلائی ہے کہ یہ بیان اس عمومیت کے ساتھ صحیح نہیں۔ اس لئے کہ راولپنڈی، نوشہرہ اور مردان کی فوجوں میں بغاوت کی تحریک ہوئی اور مرداں والی فوج کے بچے کھچے آدمی مولانا عنایت علی کے ساتھ ہو کر نارنجی اور منگل تھانہ میں لڑے۔"

عاجز یہ عرض کرتا ہے کہ مجاہدین جماعتی حیثیت سے ۵۷ء کی قومی لڑائی سے الگ رہے۔ ۵۷ء کے ہنگامہ

ہونے کی وجہ سے اس قومی لڑائی میں غیر جانبدار رہے[1]، پھر بھی پٹنہ کے کمشنر مسٹر ٹیلر (WTAYLOR) نے مولانا احمد اللہ صادق پوری متہم مقدمہ سازش پٹنہ ۱۸۶۵ء : ف دراں انڈمان ۲۸ ذی الحجہ ۱۲۹۸ھ) وغیرہ کو بہت دق کیا (۱۸۵۷ء) مگر اس افراتفری اور ہڑبونگ میں سرحد سے مواصلات کا سلسلہ بالکل منقطع ہوگیا اور مجاہدینِ سرحد ایسی آزمائش سے دوچار ہوئے کہ الامان والحفیظ۔ مولانا عبدالرحیم صادق پوری (جو مجاہدین کے لئے روپے اور سامان فراہم کرنے والوں کے سرگرم شریک اور معاون تھے) لکھتے ہیں :۔

"۱۸۵۷ء کے غدر کی وجہ سے راہ پرُخطر تھی۔ شہر سے باہر نکلنا دشوار تھا۔ املاک تہلکہ میں تھے۔ جانوں کو امن نہ تھا۔ پھر کس کو ہوش تھا اور کیونکر یہ ممکن تھا کہ سرحد کے پار فاقہ کشوں کے لئے کوئی سامان کیا جاسکتا۔ مسلسل فاقہ کشی نے حالت تباہ کردی۔ درختوں کی کونپلوں اور پتیوں پر اصحابِ صفہ کی سنت ادا ہونے لگی۔ چندماہ مسلسل غلہ پر نظر تک نہ پڑی۔ اجابتیں خون آلود ہونے

کو ایک قومی جنگ سے زیادہ اہمیت نہیں دی جاسکتی اس لئے سید صاحبؒ کے ماننے والے ایک دینی نظام سے وابستہ ہونے کے بعد اس سے الگ رہے۔ نوشہرہ اور مردان کے ایک آدھ دستوں میں مجاہدین کی "سرگرمیوں" کو "شرکت"، سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا۔ وہ تو ۱۸۵۷ء سے پہلے بھی فوجوں میں "کام" کرتے تھے، جیسا کہ ابھی اوپر ہنٹر کے حوالے سے اس قسم کی ایک "کوشش" کا ذکر آچکا ہے۔ جو مجاہدین نے ۱۸۵۲ء میں راولپنڈی کے کسی دستے کے "اندر" کی تھی۔ وہابی ٹرائل ۱۸۷۱ء میں بھی عبداللہ قواعدی نے یہ شہادت دی ہے کہ راولپنڈی کی فوجوں سے مجاہدین کا ربط قائم تھا (ص ۱۴)

[1] اسٹاڈرڈ (STODDARD) امریکی اور بعضے دوسرے یورپی مورخ خیال کرتے ہیں کہ ۱۸۵۷ء کی ہندوستان کی قومی لڑائی بھی "وہابیوں" کی دعوت کا نتیجہ تھی (حاضر العالم الاسلامی۔ ج ا ص ۲۶۳) لیکن یہ خیال صحیح نہیں۔ سید صاحبؒ کے متبعین اس قومی جنگ سے بالکل الگ رہے۔ ان کا اپنا الگ نظام تھا۔ اور وہ اس کے تابع تھے۔ ۱۸۵۷ء کی قومی جنگ ایسٹ انڈیا کمپنی کی سیاست کی پیداوار تھی۔ سرجان لارنس نے بہت صحیح کہا ہے کہ اس بغاوت کی پیدائش فوج ہی سے ہوئی۔ کسی دوسری سازش کا اس میں مطلق دخل نہیں تھا۔" (ص ۵۸۲) HISTORY OF THE PUNJAB

ملیں۔ آپ کے پاس جو کچھ نقود تھے، آپ مہاجرین وانصار پر صرف کرچکے تھے اور وہ تھا ہی کیا؟ اونٹ کے منہ میں زیرہ۔ اب اُدھر ساتھیوں کی بدگمانیاں[1] اور طعنے شروع ہو گئے۔ زندگی تلخ تھی۔ یہ وہ وقت تھا کہ اکثی اہم مضطر ہو کر متیٰ نصر اللہ پکار اٹھی تھی۔"[2]

یہی بیل و بہار تھے کہ سرکار انگریزی نے ۱۸۵۸ء میں پشاور سے جنرل کاٹن (COTTON) کی سرکردگی میں چھ ہزار فوج کے ساتھ مجاہدین پر حملہ کردیا۔ مرے کو مارے شاہ مدار، شاید ایسے ہی موقع پر کہا گیا ہو۔ مجاہدین کی اچھی خاصی تعداد مردانہ وار دادِ شجاعت دے کر شہید ہوئی۔ کچھ پہاڑوں میں چھپ گئے۔ مولانا عنایت علی نے ستھانہ کا قصد کیا، مگر راستہ ہی میں چمنی CHMNEE کے مقام پر داعی اجل کو لبیک[3] کہا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

صاحب تذکرہ صادقہ 'وفات' کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں (ص ۱۳۸):-

"مگر اس صبر و استقامت کے کوہ نے نہایت حلم و رضامندی کیساتھ اللہم بالرفیق الاعلیٰ سے زبان تر کرتے ہوئے بعارضہ بخار و ضیق النفس ۱۲۷۴ھ مطابق ۱۸۵۸ء کے آخر میں سجن المؤمن سے جنت نعیم کو رحلت کی۔"

"اللھم اغفر لہ وارحمہ واحشرہ فی زمرۃ المھاجرین الذین ھاجروا وجاھدوا مع نبیك محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔"

مختلف "امرار"

مولانا ولایت علی (ف ۱۲۶۹ھ) اور مولانا عنایت علی (ف ۱۲۷۴ھ) کے بعد بیرونِ ہند کی سرگرمیوں میں مولانا ولایت علیؒ کے بڑے صاحبزادے مولانا عبداللہ صادق پوری (مولود ۱۲۴۶ھ) کا نام زیادہ نمایاں طور پر آتا ہے۔ یہ کمسنی ہی سے اپنے والد ماجدؒ کے ساتھ جہاد و قتال میں مصروف رہے لیکن ان بزرگوں

---

[1] مولانا عبیداللہ سندھیؒ اس "ابتلاء" اور "طعن و بدگمانی" کو بھی عقیدہ غیبوبت، کا شاخسانہ بتاتے ہیں۔ یہ حد درجہ زیادتی اور ان بلاکشانِ راہِ حق پر ناروا اتہام ہے۔ ملاحظہ ہو: مولانا سندھی اور انکے افکار پر ایک نظر: ص ۸۵-۸۶

[2] تذکرہ صادقہ: ص ۱۳۸

[3] وہابی ٹرائل WAHABEETRIAL: ص ۱۰، شہادت حسینی، ماخوذ مقدمہ انبالہ۔

کے علاوہ بہتیرے اور بھی ہندوستانی مہاجر تھے، جنھوں نے سرحدی علاقے میں جہاد کا علم بلند رکھنے کی کوشش کی ـــــ واقعات کی ترتیب اور تسلسل کا تقاضا ہے کہ مولانا عبداللہ کے دَور کے "حوادث" کی تفصیل سے پہلے ان سالکانِ راہِ نبوت کا بھی مختصر ذکر کر دیا جائے۔

افسوس کہ ۱۸۵۸ء کے ابتلا کے متعلق مولوی عبدالرحیم صاحبؒ نے کوئی قابلِ ذکر بات نہیں بیان کی اور جو کچھ لکھا ہے وہ بھی اس قدر منتشر اور غیر مربوط کہ اصل "مہم" اور "معرکہ" کے متعلق معلومات میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔

انگریز لکھنے والوں میں ایچ۔ بی۔ بلّو نے اس طرف اشارہ کیا ہے:۔

"مبارک شاہ ولد سید اکبر شاہ، رئیس صوات نے عنایت علی کے ساتھ مردان کے قلعے پر قبضہ کرنے کا پلان تیار کیا، لیکن ان کا منصوبہ کامیاب نہ ہوا۔ تب عنایت علی نارنجی چلا آیا اور یوسف زئی قبائل کو ورغلانے کی کوشش کی۔ اس حرکت کی پاداش میں نارنجی والوں کی سرکوبی کے لئے پشاور سے جنرل کاٹن کی سرکردگی میں ایک انگریزی فوج بھیجی گئی، اور عنایت علی اور اس کی پارٹی کو پہاڑیوں میں بھگا دیا گیا۔"[۱]

ہنٹر نے خلافِ معمول ۱۸۵۸ء کی 'مہم' کا بالکل سرسری تذکرہ کیا ہے:۔

"لیکن ۱۸۵۷ء میں انھوں نے کھلم کھلا ہمارے خلاف محاذ بنانے کی کوشش کی۔ (خاص کر یوسف زئی اور پنجتار قبائل کے ساتھ) اور ان کی جرأت اس حد تک بڑھ گئی کہ اپنی مقررہ رقم (غالباً زکوٰۃ یا عشر) کے وصول کرنے COLLECTING THEIR BLACK MAIL کے لئے انھوں نے برطانوی حکام سے مدد طلب کی۔ اور ہمارے انکار پر انتہائی دیدہ دلیری سے انھوں نے لفٹنٹ ہورن HORNE اسسٹنٹ کمشنر کے کیمپ پر

A GONERAL REPORTICN YUSUFZAIS [۱]

شب خون مارا، جو مشکل سے اپنی جان بچا سکا۔ اب انتقامی کارروائی میں تاخیر جائز نہیں تھی، اور سڈنی کاٹن SIDNEYCOTTON پانچ ہزار کی ایک فوج لے کر پہاڑیوں میں داخل ہوا۔"

یہ ان متعدد لڑائیوں میں سے ایک کا ذکر تھا، جو جنوبی کیمپ FONOTIC CAMP نے سرحد میں برپا کی، میں اس کا سرسری ذکر کرکے گذرجانا چاہتا ہوں۔ خلاصہ یہ کہ کچھ مشکل کے بعد ہماری سپاہ نے باغیوں کے حلیفوں کی بستیوں میں آگ لگادی، دو اہم قلعے اڑادیئے اور باغیوں کی ستھانہ والی چھاونی یکسر تباہ کردی۔[1]

مشہد بالاکوٹ (۱۲۴۶ھ، ۱۸۳۱ء) سے لے کر مولانا ولایت علیؒ کے سرحد پہنچنے تک (۱۲۶۷ھ، ۱۸۵۱ء) جو باعزم اور دھن کے پکّے مجاہد سرحد میں جہاد کا علم بلند کئے رہے۔ ان کی مفصل سرگزشت مرتب طور پر نہیں ملتی۔ اسی لئے مختلف "امراء" کی ترتیب اور ان کے زمانۂ امارت کی تعیین ذرا دشوار ہے۔ ایک صاحبِ علم نے ان امراء کی ترتیب اس طرح بتائی ہے :۔

۱۔ شیخ ولی محمد پھلتی، ۲۔ مولوی نصیر الدین دہلوی، ۳۔ حاجی سید عبدالرحیم سورتی، ۴۔ مولانا عنایت علیؒ، پھر ان کے بعد ۵۔ مولانا ولایت علی الخ۔

جیمس اوکنیلے JAMS OKINELY جو ۱۸۷۱ء کے مقدمۂ سازش میں سرکار کی طرف سے پیروکار تھا اور راونشا اور ہنٹر کی نسبت جماعت، کے افکار و عقائد سے گہری واقفیت رکھتا ہے۔ (گو اس کے بیانات بھی فاش غلطیوں سے خالی نہیں) اس سلسلے میں یوں رقمطراز ہے :۔

" جس وقت سید صاحب کو بالاکوٹ میں شکست ہوئی۔ مولوی قاسم ایک مہم کے سلسلے میں مظفرآباد گئے ہوئے تھے۔ شہادت سے یہ مہم ختم ہوگئی اور جو سپاہی جنگ سے بھاگ گئے تھے، مولوی قاسم نے انہیں جمع کیا، اور انہیں

---

[1] دی انڈین مسلمانز : ص ۱۶

لے کر یہ ستھانہ روانہ ہوئے، انہیں کے ساتھ سید صاحبؒ کے اہل خاندان بھی تھے۔ یہ گاؤں سید صاحبؒ کے مخلص دوست سید اکبر شاہ کی ملکیت تھا۔ مولویوں کی شوریٰ میں فیصلہ ہوا کہ مجاہدین تختہ بند[1] (بنیر) میں قیام کریں اس گاؤں میں سید اکبر شاہ کا خاندان بہت با اثر تھا۔

سید صاحبؒ کی شہادت کے بعد ایک لیڈر کا انتخاب ضروری تھا۔ ہندوستانی خلفاء کے ذمہ یہ کام ہوا۔ یہ لوگ دہلی میں جمع ہوئے اور مولوی نصیر الدین[2] کو "امیر" منتخب کیا۔ اور یہ بھی فیصلہ ہوا کہ یہ ٹونک اور سندھ ہو کر تختہ بند ہو جائیں اور مجاہدین کے ساتھ شریک ہوں۔

نصیر الدین دہلی سے چند ساتھیوں کے ساتھ روانہ ہوئے۔ ٹونک میں مزید رنگروٹ اور روپے اور اسلحہ سے مدد کی گئی۔ وہاں سے یہ شکار پور (سندھ) روانہ ہوئے جہاں انھوں نے کچھ دنوں ٹھہرنے کا فیصلہ کیا، تاکہ سکھوں سے مقابلے کے لئے کچھ طاقت فراہم کرلیں۔ ۱۸۳۳ء میں سید صاحبؒ کے اہل خاندان اور فوج کے باقی لوگ آکر ملے، جو تختہ بند کو بھاگ گئے تھے۔ مجاہدین اصل فوج کے ساتھ سندھ میں رہے۔ البتہ سید صاحبؒ کا کنبہ ٹونک واپس آگیا۔

---

[1] ایک "صاحبِ علم" تختہ بند کی مراجعت کا واقعہ صحیح نہیں سمجھتے۔ راقم قطعی طور پر اوکنلے کے بیان کی تردید یا توثیق سے قاصر ہے۔

[2] نصیر الدین دو تھے۔ ایک نصیر الدین منگلوری، جو سید صاحب کے ساتھ جہاد میں شریک رہے۔ واقعۂ بالاکوٹ کے وقت بھوگڑ منگ میں مقیم تھے پھر شیخ ولی محمد پھلتی کی امارت میں امیرِ لشکر رہے اور ٹوپی میں شہید ہوئے۔

دوسرے نصیر الدین، شاہ محمد اسحاقؒ کے داماد تھے جو ذی الحجہ ۱۲۵۰ھ میں دہلی سے چند رفیق لے کر نکلے، سندھ اور بلوچستان میں مقیم رہے، پھر ستھانہ پہنچ گئے اور "امیر" بنے۔ وہیں وفات پائی۔ غالباً اوکنلے ان ہی مولوی نصیر الدین دہلوی کا ذکر کر دیا ہے۔

معلوم یہ ہوتا ہے کہ رنجیت سنگھ اور سکھوں کے خطرے کے باعث امرار سندھ اور 'وہابی'، متحد ہو گئے تھے اور سکھوں سے بچنے کے لئے امیر سندھ نے انہیں روک رکھا تھا۔ بہرحال وجہ کچھ بھی ہو، نصیر الدین شکارپور میں رہ گئے اور پہاڑیوں میں رہ کر جہاد کا ارادہ ترک کر دیا[1]۔ رفتہ رفتہ آدمی بڑھے۔ ہندوستان سے سرمایہ اور رنگروٹ آنے لگے، لیکن مولوی نصیر الدین نے جنبش نہ کی، اور ہزارہ پر ایک معمولی حملہ کے سوا انھوں نے سکھوں سے کوئی جنگ نہ کی۔ لیکن آخر وقت آگیا۔ لارڈ اوک لینڈ نے شاہ شجاع کو زبردستی کابل کا بادشاہ بنانا چاہا۔ تب دوست محمد نے انگریزوں کے خلاف جہاد کا اعلان کر دیا اور وہابیوں سے شرکت کی درخواست کی۔ نصیر الدین 'مدد' دینے پر مائل تھے، مگر دوسرے مولوی تیار نہیں تھے اور لوٹ آئے۔ کوئی ایک ہزار آدمی لے کر یہ کابل کی طرف بڑھے اور داور کے قریب خیمہ زن ہو کر تین سو ملتخب آدمیوں کو امیر کی امداد کے لئے بھیجا۔ یہ غزنی کی حفاظت پر متعین کئے گئے اور جب انگریزی فوج نے قلعہ پر حملہ کیا اور قبضہ آور ہو گئی، تو یہ لوگ بالکل تباہ ہو گئے۔ کابل پر بھی قبضہ ہو گیا اور بددل وہابی تتر بتر ہو گئے اور ہندوستان و بنگال کو لوٹ آئے[2]۔

غزنی کی اس مہم میں 'مجاہدین' کی شرکت کا ذکر ہنٹر نے بھی کیا ہے:۔

"گو ان کا حملہ زیادہ تر سکھ آبادیوں پر ہوتا تھا، لیکن وہ "بے دین" انگریز پر کسی حملے کے موقع کو بہت غنیمت خیال کرتے تھے۔ جنگ کابل میں ہمارے دشمن کی مدد کے لئے انھوں نے ایک مضبوط فوج بھیجی اور ان کے ایک ہزار آدمی ہمارے مقابلے میں آخر دم تک ڈٹے رہے۔ صرف غزنی کی فتح میں

---

[1] اوکنلے کا یہ قیاس بالکل غلط ہے۔

[2] اوکنلے کا مقالہ THE WAHABIS IN INDIA مندرجہ "کلکتہ ریویو" ۷۱-۱۸۷۰ء

تین سو نفوس نے برطانوی سنگینوں سے جامِ شہادت نوش کرنے کی سعادت حاصل کی۔[1]"

سقوطِ غزنی کے بعد مولوی نصیر الدینؒ سرحد پار پہنچ گئے۔ لیکن او کنلے اس باب میں خاموش ہے، وہ صرف مولوی قاسم کی واپسی کا ذکر کرتا ہے اور ساتھ ساتھ وہ تمام داستان بھی سناتا ہے جو عقیدہ غیبوبت کے عام کرنے کے سلسلے میں مولوی قاسم کی طرف منسوب ہیں۔ ہنٹر نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ مولوی قاسم سے یہ کمزوری رونما ہوئی ہو۔ بہرحال سرِدست ہمیں اس سے بحث نہیں۔

ذکر یہ تھا کہ مولوی نصیر الدین دہلوی سرحد پار پہنچ گئے۔ اور یہ اور ان کے ساتھی (جن کی تعداد تین سو کے قریب ہوگی) ستھانہ رہ پڑے۔ یہ لوگ کئی سال وہیں پڑے رہے اور غالباً ہندوستان سے امدادی رقمیں آنا شروع ہو گئی تھیں، اور مولانا ولایت علیؒ امیرِ جماعت سے ان کا ربط CONTACT قائم ہو گیا تھا۔

ایک انگریز مصنف کے بیان کے مطابق یہ لوگ مولوی نصیر الدین کی قیادت میں تین برس تک خاموش رہے کہ مجاہدین کے ایک قافلہ کو منارہ MUNARAH نامی گاؤں والوں نے لوٹ لیا۔ تو یہ لوگ حرکت میں آئے اور اس گاؤں پر ناگہانی تاخت کی، اور کافی مال و اسباب چھین لائے۔ جانیں بھی تلف ہوئیں۔ اس سے یوسف زئی والے (جو مجاہدین کے ہمدرد تھے) دشمن ہو گئے اور ان غریبوں پر حملہ کر دیا۔ بیچاروں کو سخت نقصان اٹھانا پڑا۔ اور ان کی تعداد صرف ستر اسّی کے لگ بھگ رہ گئی۔ مولوی نصیر الدین شہید ہوئے۔[2]

---

[1] دی انڈین مسلمانز: ص ۱۳

[2] مولوی نصیر الدین کی شہادت اور اس واقعے کا ذکر اب تک اور کسی سرکاری یا غیر سرکاری کتاب یا رپورٹ میں نظر سے نہیں گذرا۔ مقدمات کی کارروائیوں اور دوسرے کاغذات میں مولوی نصیر الدین کا ذکر آتا ہے۔ مگر پھر وہ درمیان سے حذف ہو جاتے ہیں اور امیر اولاد علی سرگروہِ مجاہدین کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔ اس لئے قرینِ قیاس

اس واقعے کے بعد مجاہدین مہابن کی مختلف بستیوں سے سمٹ کر پھر ستھانہ میں میر اولاد علی سورج گڑھی مونگیری کی قیادت میں مجتمع ہوئے۔ یہی وہ زمانہ ہے، جب سید ضامن شاہ رئیس کاغان راجہ گلاب سنگھ والیٔ کشمیر سے برسرِ پیکار تھا اور اس کی درخواست پر مولانا عنایت علی صاحب غازی اور میر مقصود علی ایک جماعت کے ساتھ بہار سے تشریف لائے۔ یہ تازہ وارد جماعت تین سو افراد پر مشتمل ہو گی۔ یہ لوگ پانچ پانچ اور چھ چھ کی مختلف ٹولیوں میں پکھلی (ضلع ہزارہ) تک پہنچے، جہاں میر اولاد علی کی مختصر جماعت بھی ستھانہ سے آ کر مل گئی اور مولوی عنایت علی صاحبؒ کی سرکردگی میں جدوجہد ہوتی رہی۔ مولانا ولایت علیؒ جب موقعِ جہاد پر پہنچ گئے تو پھر وہی امیر الجہاد بھی ہو گئے (۱۲۶۲ھ، ۱۸۴۶ء) تا آنکہ گلاب سنگھ نے انگریزوں سے صلح کر لی۔ مجاہدین کا قتلِ عام ہوا اور ان کی پوری فوج انگریزوں کی حراست میں آ گئی۔ روہیلے برخاست کر دیئے گئے۔ مولانا ولایت علیؒ اور مولانا عنایت علیؒ حراست میں پٹنہ بھیج دیئے گئے۔ لیکن مجاہدین کا ایک جتھا میر اولاد علی کی قیادت میں پھر ستھانہ پہنچ گیا۔

یہ جتھا ستھانہ میں کچھ عرصہ تک خاموش رہا، تا آنکہ مولانا ولایت علیؒ دوبارہ سرحد پہنچ گئے اور میر اولاد علی نے پھر قیادت ان کے سپرد کر دی۔ یہ میر اولاد علی کی قیادت کا آخری دَور تھا جو تقریباً تین چار سال رہا۔ اس کے بعد مولانا ولایت علیؒ اور ان کی وفات (۱۲۶۹ھ، ۱۸۵۲ء) کے بعد (۱۲۷۴ھ، ۱۸۵۸ء) تک مولانا عنایت علی امیر الجہاد رہے۔ غالباً میر اولاد علی کا اسی دَوران میں انتقال ہو گیا (تقریباً ۱۲۷۱ھ، ۱۸۵۵ء) جیسا کہ مقدمۂ سازش، پٹنہ ۱۸۷۱ء کے بعض گواہوں کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے۔[1]

یہی ہے کہ یہ واقعہ صحیح ہو۔ کتاب ۱۸۶۴ء میں چھپی ہے۔ اور مصنف فوج میں ڈاکٹر تھا۔

شہادت کی صحیح تاریخ بھی نہ معلوم ہو سکی۔ مگر قرین قیاس یہ ہے کہ ان کی شہادت ۱۸۴۰ء سے پہلے واقع ہو چکی تھی۔ ایک "صاحب علم" کی روایت ہے کہ ۱۸۴۱ء کی طغیانی دریائے سندھ میں ستھانہ کے ساتھ مولوی نصیر الدین صاحب کی قبر بھی بہہ گئی۔

[1] وہابی ٹرائل : ص ۱۰

مولانا عنایت علیؒ (ف ۱۲۷۴ھ، ۱۸۵۸ء) کے بعد مولوی نور اللہ امیر ہوئے ان کے دور میں ایک آدھ جھڑپ ہوئی۔ شاہ نور لرہی[1] میں مقابلہ ہوا (۱۸۵۸ء)۔ مجاہدین کے کماندار اکرام اللہ اور ان کی کافی تعداد شہید ہوئی۔ اور انگریزی فوج نے مجاہدین کی تمام نوآبادیاں تباہ کردیں۔ ستھانہ اور منگل تھانہ کی نوآبادیاں اس طرح تباہ ہوگئیں تو مولوی نور اللہ اور ان کے ساتھیوں نے ستھانہ سے دس پندرہ کوس کے فاصلے پر ملکا[2] میں اپنی نوآبادی قائم کی اسی دوران میں مولوی نور اللہ کا انتقال ہوگیا اور میر مقصود علی[3] جو وطن گئے ہوئے تھے، واپس آگئے (۱۲۷۶ھ، ۱۸۶۰ء) اور انھوں نے "امیر الجہاد" کی حیثیت سے از سرِ نو مجاہدین کی تنظیم کی۔ تقریباً ڈیڑھ سال کی امارت کے بعد میر مقصود علی کا بھی انتقال ہوگیا (۱۲۷۸ھ، ۱۸۶۲ء) ان کے بعد مولانا ولایت علی صادق پوری (ف ۱۲۶۹ھ) کے بڑے صاحبزادے مولانا عبد اللہ صادق پوری (مولود ۱۲۴۶ھ) جو اس وقت

---

[1] یہ ایک پہاڑی کا نام ہے جو ستھانہ کے عین اوپر واقع ہے۔ یہ چھ سات ہزار فٹ بلند ہوگی جب ستھانہ پر حملہ ہوا تو مجاہدین اس پر چڑھ گئے تھے۔ غالباً "لڑی" ٹیلے کو کہتے ہیں۔ صحیح لفظ شاید "شاہ نور لڑی" ہو۔

[2] ملکا سادات ستھانہ کی ملکیت تھا جہاں وہ ستھانہ کی بربادی کے بعد چلے گئے تھے۔ یہ ستھانہ سے ۳۵ میل کے فاصلہ پر ہے۔ بچے کھچے مجاہدین بھی ان کے ساتھ ہی چلے گئے تھے۔ مولانا عبد اللہ وہیں 'امیر' بنے تھے۔ جنگ امبیلا کے بعد اسے بھی برباد کر دیا گیا 'جیسا کہ آگے ذکر آتا ہے۔ اس کے بعد سادات منتشر ہوگئے اور مجاہدین جگہ جگہ اٹھتے بیٹھتے رہے۔

[3] میر مقصود علی داناپور (پٹنہ) کے رہنے والے تھے۔ اور خاندان صادق پور سے ان کی قرابت بھی تھی ۱۸۶۵ء کے مقدمۂ سازش (پٹنہ) میں ان کے سگے بھائی الٰہی بخش کی شہادت سرکاری گواہ کی حیثیت سے درج ہے۔ (وہابی ٹرائل، ص ۳۶-۳۲) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ۱۲۷۳ھ، ۱۸۵۷ء سے کئی برس پہلے مولانا ولایت علیؒ کے اہل وعیال کو لے کر وطن واپس آئے تھے اور دو تین سال مشرقی ہند میں مصروف تبلیغ رہ کر ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے کچھ عرصہ بعد پھر لاپتہ ہوگئے۔ مختلف بیانات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ ۱۲۷۶ھ، ۱۸۶۰ء تک "مستقر" پر پہنچ گئے تھے۔ ڈیڑھ دو سال کی سیادت کے بعد ان کا انتقال ہوگیا (۱۲۷۸ھ، ۱۸۶۲ء) اسی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس سے پہلے ایک مرتبہ میرٹھ میں گرفتار بھی ہوگئے تھے۔ (ص: ۳۲)

تک گھر بار چھوڑ کر سرحد پار پہنچ چکے تھے۔ امیر منتخب ہوئے۔

مولانا عبداللہ صادق پوری

۱۲۷۸ھ — ۱۳۲۰ھ
۱۸۶۲ء — ۱۹۰۲ء

اوپر گذر چکا ہے کہ مولانا ولایت علی رح فاجعہ بالاکوٹ سے چند سال پیشتر اپنے امیر و شیخ رح کے حکم سے تبلیغ وارشاد کے لئے دکن تشریف لے گئے تھے۔

اسی دوران میں انھوں نے حیدر آباد میں ایک شریف خاتون سے شادی کر لی تھی۔ آپ کے بڑے صاحبزادے مولانا عبداللہ وہیں پیدا ہوئے (۱۲۴۶ھ) ابتدائے طفولیت ہی سے یہ سفر وحضر میں اپنے والد ماجد رح کے ساتھ رہے۔ ابھی پندرہ سولہ برس کی عمر ہو گی کہ والدہ ماجدہ کے ساتھ پکھلی اور بالاکوٹ میں جہاد و قتال میں عملی شرکت کی (۱۲۶۲ھ، ۱۸۴۶ء) پھر دوبارہ اپنے والد کے ساتھ سوات گئے اور وہاں چار پانچ برس قیام رہا۔

اس دوران میں فوجی نظم وبندوبست انہیں کے سپرد تھا۔ مولانا عنایت علی رح کے دورِ امارت میں (۱۲۶۹ھ، ۱۸۵۲ء — ۱۲۷۴ھ، ۱۸۵۸ء) بھی دو تین سال وہاں رہے۔ پھر چچا کی تیز مزاجی کے باعث ان سے موافقت نہ ہوئی۔ تو اپنے چھوٹے چچا مولانا فرحت حسین صاحب (ف ۱۲۷۴ھ) کی طلب پر پٹنہ واپس آ گئے۔ لیکن گھر میں اس مردِ مجاہد کو قرار نہ آ سکا اور چار پانچ سال کے بعد اپنی تمام جائداد فروخت کر کے اپنے بھائی مولوی عبدالکریم (جو اس وقت نابالغ تھے) اور تمام اہل وعیال کے ساتھ مکہ معظمہ کی راہ لی[1] اور تقریباً ۱۲۷۶ھ، ۱۸۶۹ء میں حج وزیارت سے فراغت کے بعد صوات پہنچ گئے اور رکم وبیش دو سال میر مقصود علی کی ماتحتی میں کام کرتے رہے۔ میر مقصود علی کے انتقال کے بعد تقریباً ۱۲۷۸ھ، ۱۸۶۲ء میں آپ کو مہاجرین نے باصرار امیر، منتخب کیا۔ مولانا عبداللہ کا دورِ امارت بہت طویل اور پرآشوب رہا۔ ۱۲۷۸ھ، ۱۸۶۲ء سے ۱۳۲۰ھ، ۱۹۰۲ء تک کل بیالیس برس یہ امیر رہے۔ اس درمیان میں سرد وگرم، ہر قسم کے واقعات پیش آئے۔ ان سے خط وکتابت اور تعاون کے جرم میں شمالی ہندوستان میں گرفتاریوں اور خانہ تلاشیوں کا بازار گرم ہوا اور سازش

---

[1] شوال ۱۲۷۵ھ م مئی ۱۸۵۹ء

کے پانچ مقدمے یکے بعد دیگرے چلائے گئے (جن کی تفصیل آگے آتی ہے) سرحد پار سرکار انگریزی سے متعدد اہم معرکے پیش آئے۔

اس مختصر سی کتاب میں ان تمام واقعات کا مفصل طور پر بیان کرنا مشکل ہے۔ یہاں ہم صرف اہم واقعات کی طرف اشارہ پر اکتفا کریں گے۔

مولانا عبداللہ ۱۲۷۸ھ، ۱۸۶۲ء میں 'امیر' منتخب ہوئے۔ زمام کار ہاتھ میں لیتے ہی تن دہی اور مستعدی کے ساتھ جماعت کی فوجی تربیت میں لگ گئے۔ "تیاریوں" کا اندازہ مندرجہ ذیل بیانات سے ہوگا:۔

"لیکن ابھی دو برس بھی نہ گذرنے پائے تھے کہ باغی نو آبادی نے پہاڑی آبادیوں میں خاصہ اثر و رسوخ حاصل کرلیا۔ ۱۸۶۱ء میں یہ ملکا سے آگے بڑھے اور ستھانہ کے ٹھیک اوپر ایک مقام پر وہ قلعہ بند ہوگئے۔[1]"

"اس کے باوجود ہماری غیر وفادار ہندوستانی رعایا باغیوں کے کیمپ میں آتی رہی اور ۱۸۶۲ء میں یہ تعداد اس قدر بڑھ گئی کہ حکومتِ پنجاب دوسری سرحدی جنگ کا مشورہ دینے پر مجبور ہوئی۔ حقیقت میں صورتحال یہ ہوچکی تھی کہ وزیرِ ہند نے یہ خیال ظاہر کیا کہ باغیوں کو جلد یا دیر بزورِ شمشیر نکالنا پڑے گا اور جب تک یہ ہماری سرحد پر ہیں، مستقل خطرہ کا باعث بنے رہیں گے۔[2]"

"اس وقت تو کوئی جنگی مہم جاری کرنا ممکن نہیں تھا۔ لیکن ہم انہیں پھر اپریل ۱۸۶۳ء میں حسبِ دستور برطانوی حدود کے اندر لوٹ اور غارتگری میں مشغول پاتے ہیں۔"

اسی سال جولائی میں انھوں نے دیدہ دلیری کے ساتھ ستھانہ کی چھاونی پر قبضہ کرلیا اور ہمارے حلیف سردار انب کو تہدید آمیز پیغام بھی بھیجے۔

---

[1] انڈین مسلمانز: ص ۱۸ [2] انڈین مسلمانز: ص ۱۸

آس پاس کے قبائل نے پھر مذہبی دیوانگی کے پیچھے اپنی وفاداری کی بھینٹ
چڑھادی اور ہمارے معاہدہ کا ذرہ برابر بھی خیال نہ کیا۔ باغیوں کی نوآبادی
کا ایک مرتبہ پھر سرحد میں بول بالا ہوگیا۔ ۷ ستمبر ۱۸۶۳ء کو جہادیوں کی ایک
جماعت برطانوی علاقے پر چڑھ آئی اور ہماری رستہ دکھانے والی فوج کے
کیمپ پر شب خون مار کر انھوں نے کھلی جنگ کا سگنل دے دیا۔"[1]

یہ سب ۱۸۶۳ء کی جنگ امبیلا کی تمہید تھی۔ اصل معرکہ اور اس کے اسباب و نتائج کا تفصیلی ذکر آگے آتا ہے۔ یہاں یہ دکھانا مقصود تھا کہ مولانا عبداللہ کے "امیر" ہوتے ہی حالات بدلنا شروع ہوگئے تھے۔

ہنٹر کے بیانات تو بہرحال مبالغے سے خالی نہیں۔ صورت حال کی صحیح واقفیت کے لئے ایک دوسرے واقف کار انگریز کا مندرجہ ذیل بیان کافی ہوگا۔ یہ کسی خدمت کے سلسلے میں ۱۸۶۴ء کے لگ بھگ سرحدی علاقے میں موجود تھا اور اس کے بیانات بھی ایک حد تک مبالغہ اور ظن و تخمین سے خالی ہوتے ہیں۔

"یہ لوگ اس وقت مجاہدین کے لیڈر ہیں جو صحیح تخمینہ کے مطابق بارہ
چودہ سو کے لگ بھگ ہوں گے۔ ان کا مقصد جیسا کہ وہ بیان کرتے ہیں،....
ہندوستان میں اسلام کو از سر نو قائم کرنا ہے اور اپنے مستقر میں یہ لوگ
سختی کے ساتھ شریعت کے پابند ہیں۔ انھوں نے فوجی تنظیم کرلی ہے اور اسلحہ
سے آراستہ ہیں۔"[2]

معرکہ امبیلا ۱۸۶۳ء

مجاہدین اور انگریزی سرکار کی لڑائیوں میں درۂ امبیلا کی لڑائی کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ برطانوی افسروں نے بڑے طنطنے کے ساتھ چڑھائی کی تھی۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ انہیں اپنی مہم میں سخت ناکامی

---

[1] انڈین مسلمانز: ص ۱۹

[2] A GENERAL REPORT ON YUSUFZAIS 99-100

ہوئی اسی سے اُن کے مورخ مجاہدین کی تعداد اور سامانِ جنگ کے متعلق طرح طرح کی مبالغہ آرائیوں سے کام لیتے ہیں۔ مثال کے طور پر ملاحظہ ہو:۔

"۱۸۶۳ء کی مہم نے بڑے نقصان کے بعد ہمیں یہ سبق دیا کہ جہادیوں کی چھاونی کے خلاف معرکہ آرائی کے معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ دُنیا کی بہترین جنگجو قوموں کے ۵۳ ہزار افراد سے لڑائی مول لی جائے[1]۔"

گو ہنٹر صاحب نے اپنے بیان کی تائید میں سرکاری ریکارڈ کا حوالہ دیا ہے، پھر بھی یہ بیان حد درجہ مبالغہ آمیز ہے۔ اگر سرکار کی حریف فوج ۵۳۰۰۰ یا ۶۰۰۰۰ ہوتی، اور وہ بھی بقول ہنٹر صاحب دُنیا کی بہترین جنگجو قوموں کی، تو جنرل چیمبر لین سات ہزار کی مختصر فوج لے کر حملہ کی جرأت کس طرح کرتے۔؟

یہ ساری داستان سرائی اس لئے کی گئی ہے کہ امبیلا کی گھاٹی پر چیمبر لین کا حملہ ناکام رہا، اور وہ خود بھی بری طرح زخمی ہوا۔

"حقیقت یہ ہے کہ حملے کی اسکیم ناکام رہی۔ اصلی خیال یہ تھا کہ گھاٹی کے ذریعہ ناگہانی حملہ کر کے سامنے کی وادی پر قبضہ کر لیا جائے۔ امپریل گورنمنٹ کا حکم تھا کہ تمام فوجی نقل و حرکت ۱۵/ نومبر تک ختم ہو جائے اور یہاں ۱۴/ نومبر تک ہماری فوج آگے بڑھنے سے قاصر تھی[2]۔"

"یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے کہ باغیوں اور پناہ گزینوں کی ایک نو آبادی اندرونِ ملک کے بغاوت پسند اور مذہبی دیوانوں کی مدد کے سہارے اور تعصب و جنون کے جوش میں کھلم کھلا مقابلہ کے لئے تیار ہو جائے۔ لیکن یہ بات ذرا مشکل سے سمجھ میں آتی ہے کہ ایک مہذب اور اپ ٹو ڈیٹ لشکر کے مقابلہ میں یہ لوگ، خواہ کچھ دیر کے لئے بھی کس طرح جمے رہتے ہیں۔ اس کی توضیح کے لئے اس علاقے کی جغرافی پوزیشن سے واقفیت حاصل کرنا ضروری ہے[3]۔"

---

[1] ہنٹر: ص ۲۲-۲۱ [2] ہنٹر: ص ۲۶ [3] ہنٹر: ص ۲۰

اب اصل معرکے کی کچھ تفصیلات ملاحظہ ہوں :-

"۱۸ر اکتوبر ۱۸۶۳ء کو جنرل سر چیمبر لین SIR NEOILLE CHAMBERLAIN کی سرکردگی میں سات ہزار برطانوی سپاہ، توپ خانہ اور دوسرے سامانِ حمل و نقل سے آراستہ و پیراستہ مہم پر روانہ ہوتی ہے اور اس کروفر کے ساتھ کہ صرف اس فوج کے آرام و آسائش کی خاطر پورے پنجاب کا خون چوس لیا گیا تھا۔"[1]

"دوسری شام کو ایک دستہ امبیلا کی گھاٹی تک پہنچ گیا۔ ہماری پشت پر کافی سپاہ اور توپ خانے تھے اور یہ بڑی خوش نصیبی تھی کہ حملہ آور فوج کی مدد کا اتنا کافی انتظام موجود تھا۔ اس لئے کہ ۲۰ر کو جنرل نے محسوس کیا کہ جن قبائل کی دوستی پر اسے اعتماد تھا وہ ڈانواڈول ہو رہے ہیں اور دو روز بعد اس نے حکومت کو تار دیا کہ فوج گھاٹی کو عبور کئے بغیر رُک گئی ہے۔ ۲۳ر کو قبائل نے اپنی مخالفت کا اعلان کر دیا۔ اور چند دن بعد صوات کے مذہبی لیڈر نے بھی دشمن کے ساتھ اپنی رفاقت کا اعلان کر دیا۔ اس دوران میں سرحد سے حکومت کو تار پر تار امداد کی طلب کے موصول ہونے لگے۔ فیروزپور رجمنٹ کا ایک دستہ روانہ ہوا۔ ایک دوسرے پیادہ دستہ نے پشاور سے مہم کا رُخ کیا۔ سیالکوٹ اور لاہور سے بھی کمک روانہ ہوئی۔ تین ہفتوں کے اندر پنجاب کی چوکیاں سپاہ سے اس طرح خالی ہوئیں کہ میاں میر کا کمانڈنگ افسر مشکل سے چوبیس سنگینوں کی سلامی پیش کر سکا۔"[2]

"ادھر قبائل ہماری مختصر سی فوج کو گھیرے جا رہے تھے۔ آگے بڑھنا ممکن نہیں تھا۔ پیچھے ہٹنا شکست سے بھی بدتر ہوتا۔ ہماری اس پوزیشن سے ان لوگوں نے خوب فائدہ اٹھایا جو پہاڑی لڑائیوں ہی کے ماحول میں پل کر جوان ہوئے ہیں۔"[3]

---

[1] ہنٹر: ص ۲۲ [2] ہنٹر: ص ۲۳ [3] ہنٹر: ص ۲۴-۲۳

"ایک ایک دن کی تاخیر دشمنوں کی امیدوں اور مجنونانہ جوش میں اضافہ کر رہی تھی۔ کمک کے باوجود ہمارے جرنل کے لئے آگے بڑھنا ناممکن تھا۔ ہفتوں تک ایسا معلوم ہوتا تھا کہ برطانی فوج مرعوب ہوکر درہ کے اندر دبکی بیٹھی ہے اور وادیٔ چملا CHUMLA میں بڑھنے کا حوصلہ نہیں رکھتی۔ اس اثنا میں باجوڑ کے قبائل کے مل جانے سے دشمن کی تعداد بہت بڑھ گئی تھی۔ اور اس طرح ہماری فوج کا ہراول، میسرہ (بایاں بازو) اور عقب کی آمد و رفت خطرے میں پڑ گئی تھی۔ ۸ر نومبر کو حکومتِ پنجاب نے نہایت بے صبری کے ساتھ دریافت کیا کہ اگر جرنل کو ۱۶۰۰ پیادہ فوج کی مزید کمک بھیجی جائے تو کیا وہ ملکا کی جہادی نوآبادی کو تباہ کرنے کے لئے اقدام کر سکے گا؟ ۱۲ر نومبر کو جواب آیا کہ آگے بڑھنا اس وقت قابلِ عمل ہو سکتا ہے جب ہمارے پاس مزید دو ہزار پیادہ فوج اور کچھ توپیں ہوں۔ ساتھ ہی یہ مایوس کن پیغام بھی ملا کہ جرنل صاحب اس وقت تک ملکا پر فوج کشی کے خلاف ہیں جب تک درمیانی قبائل سے صفائی نہ ہو جائے۔"[1]

"سارے سرحدی علاقے میں آگ لگی ہوئی تھی۔ ۴ر نومبر کو حکومتِ پنجاب نے اپنی فوجی چوکیوں کو یہاں تک خالی پایا کہ وائسرائے کیمپ کے حفاظتی دستے کا ایک حصہ عاریتہً مانگنا پڑا۔ نیز سواروں اور پیادوں پر مشتمل ملٹری پولیس کی ایک جماعت، مواصلات کی حفاظت کے لئے بھیجی گئی جو دشمنوں کی وجہ سے خطرے میں تھے ـــــ ۱۴ر نومبر تک حالات اس قدر بگڑ گئے کہ برطانی ہندی فوج کے کمانڈر انچیف نے جلدی سے لاہور پہنچ کر لڑائی کی نگرانی اور سربراہی اپنے ہاتھ میں لے لی۔"[2]

"حقیقت یہ ہے کہ یہ مہم ناکام ہو چکی تھی، اور بجائے اس کے کہ

---

[1] ہنٹر: ص ۲۶-۲۵ [2] ہنٹر: ص ۲۶

کھلے میدان میں لڑائیاں ہوتیں، جن میں مہذب (؟) لڑائی کے تمام ذرائع کام میں لائے جاسکتے، ہمیں ایک بڑے پہاڑی علاقے میں مدافعانہ تدبیریں کرنی پڑیں۔ اسی روز پنجاب گورنمنٹ نے درخواست کی کہ ۱۵۰۰ آدمیوں کا ایک اور دستہ سرحد بھیج دیا جائے۔ ادھر جرنل چیمبرلین کا ۱۹ ر تاریخ کو ایک تار ملا جس سے یہ خدشہ پیدا ہوگیا کہ کہیں یہ کمک بعد از وقت نہ ثابت ہو۔

"۱۸ر کو دشمن نے زور و شور سے ہم پر حملہ کیا اور ہماری ایک چوکی پر قابض ہوگئے۔ افسروں کے علاوہ ہمارے کل ۱۱۴ آدمی مقتول اور مجروح ہوئے۔ اور ہمیں پیچھے ہٹنا پڑا۔ دوسرے دن غنیم نے ایک اور چوکی پر قبضہ کرلیا، جسے پھر ایک خونریز لڑائی کے بعد واپس لے لیا گیا۔ لیکن اس کی قیمت گراں پڑی، افسروں کے علاوہ ۱۲۸ آدمی مارے گئے یا بالکل ناکارہ ہوگئے۔"[1]

"۱۹ر نومبر تک حالت اتنی خراب ہوچکی تھی کہ جنرل نے تار دیا: فوجیوں کو پورا مہینہ دن رات سخت محنت کرنا پڑی ہے، تازہ دم دشمنوں کا نقصان کے ساتھ مقابلہ کرنا حوصلہ شکن ہے۔ ہمیں کمک کی بڑی ضرورت ہے۔ ہمارے لئے دشمن کے حملوں کا مقابلہ کرنا اور رسد کے لئے فوجی دستہ فراہم کرنا اور زخمیوں کو واپس بھیجنا بہت مشکل ہوگیا ہے۔ اگر تازہ دم فوج ان دل برداشتہ اور زخم خوردہ دستوں کی جگہ لے سکے، تو ان دستوں کو میدان میں بھیج کر ان سے امداد کا کام لیا جاسکتا ہے ـــــ یہ اشد ضروری ہے۔"

یہ تفصیلات ہنٹر کی کتاب سے لی گئی ہیں۔ ممکن، بلکہ بہت ممکن ہے کہ ان میں کچھ مبالغہ بھی ہو مگر یہ واقعہ ہے کہ ملکا کی مہم میں سرکار کو بڑی ناکامی ہوئی اور برطانوی فوج کا کافی نقصان ہوا۔ اس کی تائید مولوی محمد جعفر صاحب تھانیسری (اسیر انڈمان) کے ایک "محتاط" بیان سے بھی ہوتی ہے جو ان کی کتاب تواریخ عجیب میں ضمنی طور پر آگیا ہے۔

---

[1] ہنٹر: ص ۲۶-۲۷

"آخر ۱۸۶۳ء مطابق ۱۲۸۰ھ[1] سرحد غربی (؟) ہند پر خود سرکار کی زبردستی سے ایک جنگِ عظیم شروع ہوئی۔ جنرل چیمبرلین صاحب اس جنگ کے سپہ سالار تھے۔ امبیلے کی گھاٹی میں جاکر فوج سرکار کو بہت تکلیف ہوئی۔ مار (؟) کی مداخلتِ بیجا کے سبب سے اخوند سوات (صوات) بھی بغرض اعانت اہلِ قافلہ (یعنی مجاہدین) اپنے بہت سے مریدوں کو ساتھ لے کر شاملِ جنگ ہو گیا۔ ملکی افغان چاروں طرف سے اپنے بچاؤ کے ساتھ مقابلہ سرکار پر ٹوٹ پڑے سخت جنگ ہونے لگی ـــــ خود جنرل چیمبرلین صاحب "شدید مجروح" ہوئے۔ قریب سات ہزار کے کشت وخون کی نوبت پہنچی۔ تمام پنجاب کی چھاؤنیوں سے فوج کھینچ کر سرحد بھیجی گئی۔ اُدھر یہ گرما گرمی تھی۔ اِدھر لارڈ ایلجن صاحب وائسرائے ہند چینے کے پہاڑ پر اپنی اس حرکت اور زبردستی چھیڑ چھاڑ پر نادم ہو کر یک بیک مرگئے۔[2]

جب انگریزی فوج بلاوجہ زبردستی سے اپنی عملداری کے باہر یاغستان غیر عملداری میں چڑھائی کر کے گئی .... تو سارا ملک یاغستان مع اخوند سوات (صوات) کے سرکار سے بگڑ گیا۔ اور درۂ امبیلا پر سخت لڑائیاں ہوئیں۔ اگر لاکھوں روپے رشوت دے کر ان بگڑے ہوئے افغانوں کو راضی نہ کیا جاتا تو ایک آدمی بھی فوجِ انگریزی کا واپس نہ آتا۔

یہ ظاہر اور طبعی بات ہے کہ جب کوئی کسی غیر ملک میں اپنی حد سے باہر زبردستی لڑنے جاوے گا تو اس ملک والے اپنے بچاؤ کو ضرور مقابلہ کریں گے۔ اس سبب سے اس فضول اور زبردستی کی جنگ میں سرکار کا بہت نقصان ہوا۔

لاکھوں روپیہ رشوت دے کر افغانوں کو راضی کرنے کی تفصیل خود سرکار کے ترجمان

---

[1] ۱۲۸۰ھ، ۱۸ ار جون ۱۸۶۲ء - ۵ ر جون ۱۸۶۴ء [2] تواریخ عجیب: ص ۳

ڈاکٹر ہنٹر کی زبانی سنئے تو اچھا ہے۔ یہ پہلے بھی کہیں عرض کیا جاچکا ہے کہ ان "مجاہدین مرابطین" کی سب سے بڑی غلطی یہ تھی کہ وہ بار بار دھوکا کھانے کے باوجود خوانین پر اعتماد کرتے تھے جس طرح خود سید شہیدؒ اور اُن کے خاص رفیقوں سے یہ چوک ہوئی کہ انھوں نے افغانی قبائل کی تربیت و اصلاح کی کوشش اور اس کے نتائج کا انتظام کئے بغیر ان کے علاقے کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنالیا، اسی طرح ان کے ماننے والوں نے یہ غلطی کی کہ پہلے خود ہندوستان کے اندر فکری و عملی انقلاب کی دعوت دینے کے بجائے سرحد پار جاکر خفیہ ذرائع سے عملی تحریک کو پروان چڑھانے کی کوشش کی۔ ہمارے نزدیک دین کی تجدید و اقامت کے لئے ایک کھلی ہوئی عمومی دعوت، اصلاح اور فکری و اخلاقی انقلاب کی عام تحریک اور افکار و اخلاق کی تعمیر جدید سے کام شروع ہونا چاہیئے۔ اور اس کے لئے صحیح مقام سرحد پار نہیں بلکہ ہندوستان کے شہر اور دیہات ہیں بہرحال تحریک کی ناکامی کے اسباب پر ہم آگے چل کر پھر لکھیں گے۔ یہاں جنگِ امبیلا کے عبرتناک حشر کی داستان ملاحظہ ہو۔ خود ہنٹر صاحب راوی ہیں :۔

"لیکن جو کام ہماری سپاہ سے نہ ہوسکا، وہ ہماری ڈپلومیسی نے کردکھایا۔ سرحدی قبائل کا اتحاد ڈانواڈول ہوتا ہے۔ ۲۵ رنومبر کو پشاور کے کمشنر نے بنیر کے بعض قبیلوں کو الگ کرلیا۔ ان کے علاوہ دو ہزار کے ایک اور دستے کو گھر جانے پر راضی کرلیا۔ نیز صوات کا سردار اپنے خاص ماننے والوں کے منتشر کرنے پر راضی کرلیا گیا۔ بہت سے چھوٹے چھوٹے سردار اس برگشتگی کو بھانپ کر خود علیحدہ ہوگئے اور جاتے جاتے باقی ماندہ لوگوں کے درمیان بے اعتمادی کا بیج بوگئے۔ ار دسمبر تک بے اعتمادی کا رنگ کھلا۔ ار دسمبر کو قبائل بنیر کا بڑا جرگہ کمشنر کے ہاں آیا، لیکن شرائط نہ طے ہوسکے [1]

---

[1] ہنٹر کی کتاب کا اردو ترجمہ شائع ہوچکا ہے۔ مگر عجیب بات یہ ہے کہ مترجم نے جابجا اصل کی عبارتیں حذف کردی ہیں۔ مثال کے طور پر اس پیرا کے آخری دو جملے اردو ترجمے سے غائب ہیں۔

ہم نے اس موقع سے فائدہ اُٹھایا اور ان کو جلد فیصلہ پر مجبور کرنے کے لئے ہم نے ۱۵ر کو لیولیو LULU پر شب خون مارا اور ان کے چار سو آدمی ہلاک ہوئے۔ ۱۶ر کو ہم نے امبیلا بستی میں آگ لگادی اور قبیلے کے دو سو آدمی میدان میں مجروح یا مردہ چھوڑ دیئے۔"

"بس دوسرے ہی دن بنیر کے قبائل تیار ہو کر آئے اور کمشنر سے "ضروری احکام" کی درخواست کی۔ یہ علیحدگی جہادیوں کی امیدوں کے لئے پیام مرگ ثابت ہوئی۔ صبح شام ایک نہ ایک قبیلہ الگ ہونے لگا۔۔۔ صوات کی تمام فوج ہمہ دم الگ ہونے پر آمادہ تھی۔ یہ اتحاد و اتفاق کوہستانی کہر کی طرح آن کی آن میں رخصت ہو گیا۔ بنیر کے قبائل جن پر ان 'مجاہدین' کو اعتماد تھا، ہمارے ساتھ اس معاہدہ پر متفق ہوئے کہ جہادیوں کو ان کے نیستاں ہی میں جلا کر راکھ کر دیا جائے۔"

"ایک ہفتہ کے اندر ایک قوی برطانی دستے نے بنیر کی رہنمائی اور مدد کے سہارے کامل امن و امان کے ساتھ پہاڑیوں سے گذر کر ملکا کی جہادی چھاونی کو آلیا اور اُسے خاک کر کے دم لیا۔ یہ دستہ بدنصیب امبیلا گھاٹی کے قریب ۲۳ر دسمبر کو پہنچا اور ۲۵ر کو پھر کھلے میدان میں تھا۔ واپسی میں ایک فائر کی بھی ضرورت نہ پڑی۔"[1]

اسی مہم امبیلا کے متعلق ایک اور بیان ملاحظہ ہو۔ سید محمد لطیف، جنھیں سید شہیدؒ اور ان کی جماعت سے خاص پرخاش معلوم ہوتی ہے اپنی کتاب تاریخ پنجاب میں لکھتے ہیں:۔

"مجاہدین ستھانہ کے خلاف فوجی اقدام مہم امبیلا کے نام سے موسوم ہے، اس کا قائد جنرل نیولی چیمبرلین تھا۔ مجاہدین ملکا کے آس پاس بڑی تعداد میں جمع ہوئے۔ اس پہاڑ کے شمالی جانب جو دریائے سندھ کو دریائے کابل سے

---

[1] ہنٹر: ص ۳۰-۲۹

جدا کرتا ہے، لڑائی دست بدست اور بہت سخت ہوئی۔ ایک معرکہ میں خود جنرل سخت زخمی ہوا۔ پھر کمک پر کمک آئی۔ اور جنرل کرکاک نے انہیں لیو لیو کے مقام پر شکست دی اور دشمن (؟ یہ ایک مسلمان کی تحریر ہے) پیٹھ پھیر کر بھاگے۔ مجاہدین کا مرکز ملکا قبضہ کے بعد نذرِ آتش کر دیا گیا، اور ......[1]"

اس مہم امبیلا کے سلسلے میں ایک بات رہی جاتی ہے۔ جب یہ مہم ناکام رہی اور تمام جبر و تعدی کے باوجود مولانا عبد اللہ صادق پوری کی جماعت زندہ رہ گئی تو سرکار انگریزی نے مولانا عبد الرحیم صادق پوری (ابن عم مولانا عبد اللہ) کے ذریعہ مصالحت چاہی، جو اُن دنوں (۱۸۶۴ء) مقدمۂ سازش انبالہ کے سلسلے میں سزایاب ہو کر انڈمان بھیجے جا رہے تھے۔ مولانا عبد الرحیم (ف ۱۳۴۱ھ، ۱۹۲۳ء) اس گفتگوئے مصالحت کا ذکر ان "محتاط" لفظوں میں کرتے ہیں:۔

"اس وقت ایک اور امتحان اس نالائق پر خاص کر کے کہ کمشنر صاحب و ڈپٹی کمشنر صاحب کی خواہش ہوئی کہ بذریعہ کمترین مولوی عبد اللہ ساکن افغانستان سے پیغامِ مصالحت کیا جائے کہ جن سے بہ مقام امبیلا سرکار سے جنگ ہوئی تھی اور وہ اس کمترین کے چچازاد بھائی تھے ..."

اس گفتگوئے مصالحت کا حشر جو کچھ ہوا ہو گا، وہ مولوی عبد الرحیم صاحب کی خاموشی سے ظاہر ہے۔

اس مہم کے بعد چار سال ایک گونہ خاموشی رہی۔ پھر ۱۸۶۷ء میں "چھیڑ چھاڑ" کا ذکر آتا ہے، ۱۸۶۸ء میں باضابطہ لشکر کشی کے واقعات ملتے ہیں، ہنٹر نے اس سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ درج ذیل ہے:۔

"بہرحال اب کے برطانوی حکام بالکل تیار تھے۔ ۸ ستمبر کو مرکزی حکومت نے قبائلیوں کی سرکوبی کے لئے لشکر کشی کی اجازت دے دی۔ ۲۰ اکتوبر

---

[1] HISTORY OF THE PUNJAB : ص ۵۸۶

کوکمانڈر انچیف کی زیرِ ہدایت اور جنرل وائلڈ سی۔ بی کی قیادت میں فوجیں روانہ ہوئیں۔

اس کے ساتھ ہی ہم نے قبائل کے نام اعلان شائع کیا، جس میں بیان کیا گیا کہ کس طرح بعض ایسے قبیلے جن پر ہم نے کوئی زیادتی کی تھی اور نہ ان کے علاقے میں کوئی مداخلت کی تھی، ہماری چوکی پر حملہ کرنے کے بعد تلواروں اور جھنڈوں کے ساتھ ہمارے علاقے میں آگھسے تھے اور ہمارے بعض دیہاتوں کو جلا دیا تھا، لہٰذا اب ان کی سرکوبی ضروری ہوگئی ہے، برطانوی حکومت جسے بہت پریشان کیا جا چکا ہے، اب زیادہ برداشت نہیں کرسکتی اور اب آپ لوگوں کو حکم دیا جاتا ہے کہ اس کا جواب دیں[1] جنگ شروع ہوئی، اور برطانوی اقدام شروع ہوا۔ مگر سابق تجربوں کی روشنی میں دوسرے ڈھنگ پر اب کے پنجاب کی فوجی چھاؤنیاں کمزور نہیں کی گئیں، بلکہ شمالی مغربی صوبوں (موجودہ صوبہ جات متحدہ) سے فوجیں منگوائی گئیں۔ اصل لڑنے والا دستہ چھ سات ہزار باقاعدہ فوج پر مشتمل تھا۔ اس کے علاوہ سرحد کی فوج تقریباً دوگنی کردی گئی اور اس طرح پر ہندوستان کی سپاہ کا کل سرسبد پہاڑی جہادیوں کی سرکوبی میں لگ گیا۔[2]

—— لیکن ان سب طنطنوں کے بعد، ہنٹر صاحب کے یہ جملے قابلِ غور ہیں

"اس کے باوجود ہم اب کے بھی "خرابی" کی تہ تک پہنچنے میں ناکام رہے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس بغاوت کے فوری اور راست DIRECT اسباب میں مذہب[3] کا کہاں تک دخل تھا۔ لیکن پنجاب گورنمنٹ نے مہم کے نتائج کا جائزہ لیتے ہوئے افسوس ظاہر کیا کہ مہم ختم ہوگئی اور ہم نہ تو اس

---

[1] ہنٹر: ص ۳۲-۳۱ [2] ہنٹر: ص ۳۲ (ملخص)

[3] اردو ترجمے میں جانے یہ جملہ کیوں حذف کردیا گیا ہے۔

قابل ہو سکے کہ ہندوستانی جہادیوں کو نکال باہر کریں اور نہ انھیں مطیع کر کے ہندوستان واپس جانے پر آمادہ کر سکے۔[1]

—— یہ آخری مہم ہے جس کی تفصیل ہم تک پہنچی ہے۔ ۱۸۷۹ء کی ایک فوج کشی کے متعلق ایک صاحب تحریر فرماتے ہیں:-

"ہنٹر نے ۱۸۷۱ء میں لکھا تھا[2] کہ جب جنگ ہو گی —— اور جلد یا دیر افغانوں سے جنگ چھڑنا ضروری ہے —— تو ہماری سرحد کی باغی نوآبادیاں دشمن کے لئے بہت کار آمد ہوں گی —— لیکن ۱۸۷۹ء کے پورے افغان چڑھائی میں نہ تو ستھانہ کی نوآبادی اور نہ شورش پسند وہابیوں کا کہیں ذکر آیا۔[3]" پھر ۱۸۹۰ء کی بابت ایک دوسرے صاحب ارشاد فرماتے ہیں:-

"۱۸۹۰ء تک یہ لوگ خطرے سے خالی نہیں تھے۔[4]"

بہرحال ۱۸۷۱ء کے بعد مرابطینِ سرحد کے حالات اب تک منضبط نہیں ہو سکے ہیں۔ تاریخ کے طالبِ علم کے لئے یہ تحقیق کا دلچسپ موضوع ہے، جہاں تک چھان بین اور ذاتی تحقیق سے معلوم ہو سکا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے:-

مولانا عبد اللہ صادق پوری اپنی زندگی کے آخری لمحۂ حیات تک اس راہ پر ثابت قدم رہے۔ ان کی وفات شعبان ۱۳۲۰ھ، نومبر ۱۹۰۲ء میں ہوئی۔ ان کے بعد، ان کے چھوٹے بھائی مولانا عبد الکریم (مولود غالباً ۱۲۵۵ھ) کو "تنظیم جماعت اور عسکری امارت" سپرد ہوئی۔ افراد جماعت آپ سے مطمئن تھے۔ دانش مندی اور مصلحت اندیشی سے اپنی زندگی گذاری۔ ان کا انتقال ۲۵ ربیع الاول ۱۳۳۳ھ کو صوات بنیر میں ہوا۔

---

[1] ہنٹر: ص ۳۳   [2] انڈین مسلمانز: ص ۳۴

[3] EREHETSEX کا مقالہ "وہابیت کی تاریخ عرب اور ہندوستان میں"، مندرجہ جرنل رائل ایشیاٹک سوسائٹی بمبئی۔ جلد ۱۴، ص ۳۶۸

[4] انسائیکلو پیڈیا آف اسلام۔ جلد ۴، ص ۱۰۸۹

اس آخری دور میں مولانا عبد اللہؒ کے پوتے غازی نعمت اللہ شہید امارت پر فائز تھے اور ایک پنجابی مدعی جہاد (جو اب تک مفرور رہے) کی سازش سے ایک پنجابی نوجوان نے پستول سے ان کا خاتمہ کر دیا۔[1]

ان کے بعد مولانا عبد اللہ کے دوسرے پوتے رحمت اللہ غازی، مرابطین کے امیر ہیں۔ اس وقت یہ غالباً زندہ ہیں اور غازی نعمت اللہ کے صاحبزادے بھی جماعت میں نمایاں ہیں جنھیں عام طور پر شہزادہ[2] کہا جاتا ہے اور ان دونوں کے ساتھ ماننے والوں کی مختصر تعداد وہاں مقیم ہے۔ اور یہ برائے نام امامت و امارت اب تک قائم ہے۔

"رسی جل چکی مگر بل باقی ہیں"

---

[1] نعمت اللہ شہیدؒ کی شہادت کے باب میں بڑا اختلاف ہے۔ ایک روایت یہ ہے کہ بعض تیز مزاج جوانوں کے دلوں میں یہ شبہ پیدا ہو گیا تھا یا پیدا کر دیا گیا تھا کہ نعمت اللہ انگریزوں سے مل گئے ہیں۔ راقم کا اشارہ جن صاحب کی طرف ہے، ان کے ایک معتقد نے راقم سے اس "الزام" کی شکایت کی اور ان کو بری الذمہ قرار دیا۔ لیکن شہادت اور تفصیلات طلب کرنے کے باوجود وہ اب تک میری مدد نہیں کر سکے۔

[2] اس لقب ہی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ "مجاہدین" کی اولاد میں وہ روح کہاں تک کارفرما ہے؟

پانچواں باب

ہندوستان کے اندر

یہ اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ سید صاحبؒ کی شہادت (۱۲۴۶ھ) کے بعد مولانا ولایت علیؒ نے زمامِ قیادت اپنے ہاتھ میں لی۔ اور پوری جماعت نے آپ کے ہاتھ پر بیعت جہاد کی تجدید کی (۱۲۴۸ھ) شروع شروع ملک کے اندر اور باہر (یعنی جہاد بالسیف اور مال و اسباب کی فراہمی) دونوں کام مولانا ولایت علیؒ ہی کی نگرانی میں چلتے رہے۔ مگر جب مستقل طور پر بیرونِ سرحد کو ہجرت کر گئے (۱۲۶۵ھ یا ۱۲۶۶ھ) تو ان کے چھوٹے بھائی مولانا فرحت حسین صاحب[۱] نے اندرونی نظم و تبلیغ کا کام سنبھالا۔ اور تمام کاموں میں لوگ ان کی طرف رجوع کرنے لگے۔ آپ کی وفات تک (۱۲۷۴ھ) اندرون ملک کی رہنمائی اور سربراہی یکسر آپ کے ہاتھ میں رہی۔

ان کے بعد مولانا یحییٰ علی جعفری[۲] صادق پوری نے نظم و نسق کو سنبھالا اور ایک عرصہ تک تحریک کو حیرت انگیز طریقے پر چلاتے رہے تا آنکہ ۱۲۸۰ھ، ۱۸۶۴ء میں ایک بڑی جماعت کے ساتھ گرفتار کر لئے گئے۔ انبالہ میں مقدمہ چلا۔ پھر انڈمان بھیجے گئے (جنوری ۱۸۶۶ء)

---

[۱] مولود ۱۲۲۶ھ تفصیلی حالات کے لئے "تذکرہ صادقہ (ص ۱۴۵ - ۱۴۱) ملاحظہ کی جائے۔

[۲] مولود تقریباً ۱۲۳۸ھ، ذاتی حالات کی تفصیل کے لئے تذکرہ صادقہ (ص ۸۰ - ۷۳) کی طرف رجوع کیا جائے۔

اور وہیں ۱۲۸۴ھ، ۱۸۶۸ء میں انتقال ہوا۔ (ان کے حالات اور کارناموں کا مختصر بیان آگے آتا ہے)۔

مولانا یحییٰ علیؒ کی گرفتاری یا مقدمہ سازش انبالہ کے بعد ان کے بڑے بھائی مولانا احمد اللہ[1] نے کام سنبھالا۔ تاآنکہ ۱۲۸۱ھ، ۱۸۶۵ء میں ان پر بھی مستقل مقدمہ چلایا گیا۔ وہ بھی انڈمان بھیجے گئے، اور وہیں سپرد خاک ہوئے (۲۰ ذی الحجہ ۱۲۹۸ھ، ۱۸۸۱ء)

مولانا احمد اللہ کی گرفتاری کے بعد مولوی مبارک علی صاحب تنظیم کے ذمہ دار ہوئے۔ یہ صادق پور کے نہیں تھے بلکہ اطراف حاجی پور ضلع مظفر پور کے رہنے والے تھے۔ مولانا ولایت علی (ف ۱۲۶۹ھ) یا مولانا فرحت علی (ف ۱۲۷۴ھ) سے بیعت تھی۔ جماعت کی تنظیم کے سلسلے میں یہیں رہ پڑے۔ مولانا احمد اللہ کی گرفتاری کے بعد جماعت کا کام ہاتھ میں لینا بڑی آزمائش کا کام تھا۔ پٹنہ کی زمین خون کی پیاسی ہو رہی تھی۔ ملک کے طول وعرض میں دار وگیر کا سلسلہ جاری تھا۔ قسمت برگشتہ کی طرح سرکار کی چشم التفات کیا پھری، عظیم آباد کے رئیسوں اور جاہ پسندوں کے تیور بھی بدل گئے۔ ۔ ۔ ۔ ایک عجیب قیامت کا سماں تھا۔ ان حالات میں مولوی مبارک علی صاحب نے جان جوکھم میں ڈال کر تنظیم جماعت کا کام اپنے ہاتھ میں لیا اور ایک عرصہ تک اپنا فرض حسن وخوبی کے ساتھ انجام دیتے رہے۔" مقدمات سازش کی پیروی میں بھی انھوں نے مولوی محمد حسین صاحب ذبیح (فرزند مولانا ولایت علیؒ) کا ہاتھ بٹایا۔

جب آپ ضعیف ہوئے تو اپنی نیابت کے لئے مولوی محمد حسین صاحبؒ کو تجویز و منتخب کیا اور ان کی تربیت میں پوری کوشش کی ـــــ مگر یہ تنظیم کا کام اُن دنوں اتنا آسان نہیں تھا کہ مولوی مبارک علی صاحب سرکار کی نظر عنایت سے محروم رہ جاتے۔ کسی حیلے سے انھیں بھی حبس وزنداں سے نوازا گیا (۱۸۶۸ء) غالباً اُن کی گرفتاری ۱۸۶۸ء م ۱۲۸۵ھ کے اواخر میں ہوئی۔ اس لئے کہ مقدمہ سازش پٹنہ (۱۸۷۱ء) کے

---

[1] مولود ۱۲۲۳ھ، تفصیل کے لئے تذکرۂ صادقہ (ص ۵۹-۴۴) ملاحظہ کی جائے۔

ایک سرکاری گواہ ہریش چندر مکرجی کلرک ڈاک خانہ پٹنہ، کا بیان ہے کہ انھوں نے ۷ مئی اور ۲۷ مئی ۱۸۶۸ء کو دو رجسٹرڈ خط دہلی بھیجے تھے، اور جس کی رسید نہ ملنے پر انھوں نے ۲۸ نومبر کو ایک باضابطہ درخواست بھی دی تھی۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے خطوط پر سنسر پیشتر سے ہو رہا تھا[1] ـــــ پھر ۱۸۷۱ء کے مقدمہ سازش میں بھی انھیں دھر گھسیٹا گیا۔ سزا تو عبور دریائے شور کی ہوئی۔ مگر انھیں قید میں اتنی تکالیف و اذیت دی گئی کہ وہیں جاں بحق ہوئے[2]۔ مولوی مبارک علی صاحب پر یہ بھی الزام تھا کہ انھوں نے جہاد پر ایک کتاب تالیف کی تھی[3]۔

مولوی مبارک علی صاحب کی گرفتاری کے بعد مولوی محمد حسن صاحب[4] ذبیح خلف مولانا ولایت علیؒ نے کام کو سنبھالا۔ مولوی محمد حسن صاحبؒ کا حال عجیب و غریب اور سبق آموز ہے۔ وہ ابھی بے فکری اور تنعم کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ ان کی عمر سولہ برس سے زیادہ نہ ہوگی کہ خاندان کا ظاہری طمطراق ختم ہونے کو آیا۔ اور آخرت میں سرخروئی کا

---

[1] وہابی ٹرائل: ص ۹۶

[2] سال وفات نہیں معلوم۔ سرکاری کاغذات سے ۱۸۶۸ء کی گرفتاری پھر ۱۸۷۱ء کے مقدمہ سازش میں شمولیت اور سزایابی کا ذکر آتا ہے۔ پھر کچھ پتہ نہیں ملتا۔ "قید خانے کی اذیتوں اور انہیں تکالیف کے عالم میں واصل بحق ہونے کی روایت ایک نہایت معتبر بزرگ کی زبانی ہے۔ ۱۹۴۰ء میں ان کی زیارت ہوئی تھی۔ عمر ۸۰ سے اوپر تھی اور ہوش و حواس بالکل بجا۔ ان سے مل کر اندازہ ہوا کہ اُن کے بزرگوں کا کیا حال رہا ہوگا۔ قرائن بھی یہی ہیں کہ مولوی مبارک علی صاحب انڈمان جانے سے پہلے ہی قضا کر گئے، اس لئے کہ مولوی عبدالرحیم صاحب نے اکثر رفقائے ابتلا کا ذکر کیا ہے، اگر یہ وہاں ہوتے تو اتنی اہم شخصیت کا تذکرہ ضرور آتا۔ مزید یہ کہ ۱۳۰۰ھ، ۱۸۸۳ء میں جب اسیرانِ بلا رہا ہوئے تو اس وقت انڈمان میں صرف چھ آدمی تھے جن کے نام آگے آئیں گے، ان میں مولوی مبارک علی کا نام نہیں آتا۔ حالانکہ ان کے صاحبزادے تبارک علی (ماخوذ مقدمہ سازش ۱۸۷۱ء کا نام ان چھ میں آتا ہے۔

[3] وہابی ٹرائل: ص ۸۶ [4] مولود ۱۲۶۴ھ، تفصیل کے لئے تذکرۂ صادقہ: ص ۱۵۲ - ۱۶۰

سامان تیار ہوا۔ مقدمہ سازش انبالہ (۱۲۸۰ھ، ۱۸۶۴ء) کے سلسلے میں جب اُن کے چچازاد بھائی مولانا عبدالرحیم گرفتار ہونے لگے تو انھوں نے مولوی محمد حسین کو بلا کر کہا:
"اب میں جاتا ہوں۔ لو اب گھر بار کی تم خبر گیری کرو۔"

یہ سننا تھا کہ اس سولہ سالہ نوعمر لڑکے کا رنگ ہی بدل گیا۔ ایک طرف "سازش" کے مقدموں کی پیروی میں کلکتہ سے لے کر انبالہ تک کی دوڑ، دوسری جانب ایک بڑے کنبے کے بچوں، بچیوں اور عورتوں کی خبر گیری۔ ناز کے پلے ہوئے بچے اور بچیاں جن کے باپ دادا، چچا، ماموں یا تو شہید ہو چکے تھے یا میدانِ جہاد میں تھے اور باقی ماندہ اب سرکاری مہمان خانے میں بھیجے جا رہے تھے جن کے گھر بار اور جائدادیں ضبط کر لی گئی تھیں۔ بزرگوں کی قبریں تک اکھاڑ کر پھینک دی گئی تھیں۔ زمانے کی نگاہ بدل چکی تھی —— ان جاں گسل حالات میں مولوی محمد حسن مرحوم نے وہ کر دکھایا جو بڑے بڑوں سے نہ ہوتا۔ حیرت ہوتی ہے یہ سن کر کہ انھوں نے اس کمسنی اور بے کسی کے عالم میں لندن تک سے پیروی کے لئے بیرسٹر بلوائے۔ اور جزائر انڈمان جا کر اسیرانِ بلا کی مزاج پرسی بھی کی۔ مقدمات و ابتلاء کا حال تو اپنی جگہ پر آئے گا۔ مولوی محمد حسن مرحوم کے متعلق یہاں پر اتنا عرض کر دینا مناسب ہوگا کہ انھوں نے خاندان کی تعلیمی پالیسی کے بدلنے اور سر سید کی طرح حکومت کی برہمی دور کرنے کی بڑی کوشش کی۔ ۱۳۰۱ھ، ۱۸۸۴ء میں صوبہ کا پہلا مسلم ہائی سکول (محمڈن اینگلو عربک سکول) کے نام سے قائم کیا تھا، جو آج تک چل رہا ہے۔ نیز پٹنہ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے نام سے صوبے کا پہلا اردو اخبار جاری کیا۔ اپنے دو عزیزوں کو لندن تعلیم کے لئے بھیجا۔ سرکار نے بھی ۱۸۸۸ء میں "شمس العلماء" کے خطاب سے ان کوششوں کی داد دی۔ انہیں کی روش پر مولوی محمد عیسیٰ (مولود تقریباً ۱۲۶۲ھ خلف مولانا یحییٰ علی صاحب، جو بہار

لہ مولوی محمد حسن صاحب مرحوم کی ان محیر العقول کوششوں کے صلے میں پٹنہ کے کلکٹر مسٹر راونشا نے اپنے میمورنڈم میں انہیں "بڑا بدمعاش" AGREOTRASCAL کے لقب سے یاد کیا ہے ـــ (کلکتہ گزٹ، ۲۰ ستمبر ۱۸۶۵ء)

سرحد میں شریک ہو چکے تھے، نے اپنا نام امجد علی رکھ کر انگریزی پڑھی اور ایم، اے کیا۔ اور دنیا میں شمس العلماء مولانا امجد علی ایم، اے (پروفیسر گورنمنٹ میوسنٹرل کالج، الہ آباد) کے نام سے متعارف ہوئے۔ (ف ۱۳۴۱ھ) اسی طرح مولوی عبدالقدیر (مولود ۱۲۵۹ھ خلف مولانا احمداللہؒ) نے بھی میدانِ جہاد سے واپسی کے بعد اشرف علی نام بدل کر عربی علوم اور طب کی تحصیل کی۔ پھر ایم، اے تک نئی تعلیم حاصل کی اور مختلف مقامات میں "نگاہِ خسروانہ" سے بچ بچ کر ملازمت کی۔ ۱۳۲۶ھ، ۱۹۰۸ء میں وفات پائی۔ پھر تو اس خاندان میں نئی تعلیم کی ایسی ریل پیل ہوئی کہ باید و شاید ـــــ!

شمس العلماء محمد حسن صاحب سے اور بھی ان کی "قوم" کو توقعات تھیں مگر وائے افسوس کہ عین شباب کے عالم میں پیامِ اجل آگیا۔ ۷ ربیع الاول ۱۳۰۷ھ، ۲ نومبر ۱۸۸۹ء) اس سلسلے میں ایک اور حقیقت کا اظہار کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ممکن ہے، بعض صاحبوں کو "رازِ درونِ پردہ" کا یہ انکشاف پسند نہ آئے، مگر اب یہ حضرات "تاریخ" بن چکے ہیں، اس لئے آنے والوں کے لئے صحیح معلومات فراہم کرنے میں تامل نہ ہونا چاہیئے۔ کہنا یہ ہے کہ مولوی محمد حسن صاحب کی اس تعلیمی پالیسی سے خاندان کے تمام افراد خوش نہیں تھے۔ بعضے بعضے اصحاب متقشف عالم اور ڈاکٹر اہلِ حدیث بھی تھے۔ مثال کے طور پر مشہور اہلِ حدیث عالم مولانا عبدالحکیم صادق پوری (۱۲۶۱ھ۔۱۳۳۷ھ) خلف مولانا احمداللہؒ اسیر انڈمان، تو اتنے سخت تھے کہ انھوں نے مولوی محمد حسن صاحب مرحوم کی نمازِ جنازہ بھی نہیں پڑھی۔

مولوی محمد حسن صاحبؒ کی زندگی ہی میں مولانا عبدالرحیم صاحبؒ انڈمان سے واپس آچکے تھے (۱۳۰۰ھ، ۱۸۸۳ء) اس لئے خود بخود نظم و ارشاد کا کام ان کی نگرانی کے باوجود مولانا عبدالرحیمؒ (ف ۱۳۴۱ھ) کچھ نہ کچھ کرتے رہے ـــــ

اب غالباً یہ سلسلہ بند ہو چکا تھا۔ یقین کے ساتھ کچھ کہنا مشکل ہے۔ مولانا عبدالرحیمؒ نے اپنے آخری دورِ حیات میں خاندان کے بعض افراد کی خاص طور پر تربیت کی تھی۔ وہ لوگ بحمداللہ زندہ ہیں اور اپنے بزرگوں کے مسلک پر قائم۔

نظامِ عمل

اندرونِ ہند کے امراء اور ناظمین کی فہرست ہم نے بالترتیب درج کردی ہے۔ رہ گئی یہ بات کہ یہ لوگ کیا کرتے تھے اور کس طرح کرتے تھے؟ سو اس کے متعلق بھی یہاں مختصر طور پر عرض کرنا ضروری ہے تاکہ تحریک کا یہ اہم حصّہ تشنۂ بیان نہ رہ جائے۔

"کیا کرتے تھے؟[1]" کے متعلق کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں، کہ یہ اوپر بارہا گذر چکا ہے۔ یہ لوگ اندرونِ ملک اور خاص کر بنگال و بہار کے اضلاع سے آدمی اور رقم فراہم کرکے بھیجا کرتے جو مبلغ اور محصل آدمی اور رقم کی فراہمی کا کام کرتے، وہی ترکِ بدعات اور اتباعِ سنت کی بھی تبلیغ کرتے۔ اس طرح پر حضرت سید شہیدؒ کی تحریک کے دونوں اجزاء (جہاد اور محوِ بدعات) ساتھ ساتھ انجام پاتے تھے۔

"اب رہا یہ کہ کیسے کرتے تھے؟" سو اس کا جواب سننے کے لئے دل و جگر چاہیئے۔ حضرت سید صاحب کی شہادت ۱۲۴۶ھ، ۱۸۳۱ء میں ہوئی، اور پٹنہ کا آخری مقدمہ سازش ۱۲۸۸ھ، ۱۸۷۱ء میں چلایا گیا۔ یہ چالیس برس کا عرصہ سید صاحبؒ کے ماننے والوں کے لئے یکسر تگ و دو اور جد وجہد کا زمانہ تھا۔ اس کی سرگزشت بہت طویل ہے۔ نہ کسی میں سُننے کی تاب ہے اور نہ سُنانے کی اجازت ہے۔ اور بڑی دقت یہ ہے کہ کسی مردِ مومن نے اب تک اس جماعت کی تاریخ مرتب کرنے کی کوشش نہیں کی۔ سر ولیم ولسن ہنٹر کی رسوائے عالم کتاب ہندوستانی مسلمان THE INDIAN MUSALMANS فرنگی مورخوں کا مجمع

---

[1] مسٹر جیمس اوکنلے نے "وہابیوں" کی سرگرمیوں اور "باغیانہ" حرکات کے سلسلے میں بنگال کے فرضی فرقہ، دادو میاں ٹیٹو میاں اور حاجی شریعت اللہ وغیرہم اور ان کی متشددانہ اعمال کا تذکرہ بڑے شد و مد کے ساتھ کیا ہے (ملاحظہ ہو اوکنلے کا مقالہ "ہندوستان میں وہابی" مندرجہ کلکتہ ریویو ۱۸۷۰ء) یہ واقعات غالباً صحیح ہوں گے۔ مگر ہم اب تک سید صاحبؒ کی جماعت سے اس کا رشتہ معلوم کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ (انسائیکلو پیڈیا آف اسلام جلد ۲، ص ۵۹-۵۷) میں خان بہادر مولوی ہدایت حسین مرحوم نے فرائضی پر مقالہ لکھا ہے اور غالباً بنگالی ہونے کے باعث وہ زیادہ واقف ہوں گے ان کے مقالے سے بھی سیّد صاحبؒ کی جماعت سے دادو میاں اور حاجی شریعت اللہ کا تعلق نہیں معلوم ہوتا۔ غالباً یہ اوکنلے صاحب کے دماغ کی اُپج ہے۔

ہے۔ اور خود اس سفید فام لال بجھکڑ کا زیادہ تر اعتماد پٹنہ کے کلکٹر مسٹر راونشا کی اس یادداشت پر ہے جو اس نے مقدمہ سازش پٹنہ (۱۸۶۵ء) کے سلسلے میں حکومت کے سامنے پیش کی تھی۔ یہ یادداشت ہمارے سامنے ہے اور شروع سے آخر تک طرح طرح کی مبالغہ آرائیوں اور افترا پردازیوں سے بھری ہوئی ہے۔ بہرحال جہاں تک ممکن ہو سکا ہے، راقم نے صحیح معلومات اخذ کرنے کی کوشش کی ہے، جس کا خلاصہ نذرِ ناظرین ہے۔

اس سلسلے میں تمہید کے طور پر ایک بات اور عرض کردی جائے۔ تو شاید نامناسب نہ ہوگا ہنٹر کی کتاب ۱۸۷۱ء میں شائع ہوئی تھی اور سرسید مرحوم (ف ۱۸۹۲ء) نے بروقت اس کا جواب بھی لکھا تھا (۱۸۷۲ء) اور ان کی کوششیں، مشکور بھی ہوئیں ــــ نیز نواب صدیق حسن خاں (ف ۱۳۰۷ھ) نے اپنے مختلف رسالوں اور مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی (ف ۱۳۳۰ھ) نے اپنے رسالہ اشاعت السنہ اور بعض تصنیفات کے ذریعہ الزام "جہاد و بغاوت" کی خوب تردیدیں کیں ــــ لیکن اب حالات بدل چکے ہیں۔ ہمیں مذہبی دیوانہ FANATIC اور غدار یا باغی DISLOYAL کے القاب پر شرمندہ نہیں ہونا چاہیئے۔ یہ تو اپنی اپنی پسند ہے اور اپنی اپنی اصطلاح :۔

خرد کا نام جنوں رکھ دیا، جنوں کا خرد ــــ جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

اب ان کے کام کا مختصر خاکہ ملاحظہ ہو:۔

۱۔ ہر گاؤں اور ضلع واعظوں کا اماموں کا تقرر جیسا کہ مولانا عنایت علی (ف ۱۲۷۴ء، ۱۸۶۸ء) کے حالات میں گذر چکا ہے۔

۲۔ چند چھوٹے مقامات کو ملا کر ایک بڑے امام یا مبلغ کی زیرِ نگرانی کر دیا جاتا تھا۔

۳۔ ملک کے مختلف حصوں میں دیانت دار اور خوش حال تاجروں کے پاس اس نوع کی رقم جمع ہوتی (یہ رقمیں صدقاتِ واجبہ اور عام تبرعات، دونوں قسم کی ہوتیں) اور وہاں سے ہنڈیوں اور دوسرے ذرائع سے (کبھی کبھی خاص قاصدوں کی معرفت) پٹنہ، دہلی، تھانیسر، راولپنڈی وغیرہ تک یہ امانت پہنچائی جاتی، جہاں سے

خاص ذریعوں[1] سے منزلِ مقصود تک "ہدیے" پہنچ جاتے۔ اس قسم کے تاجرِ پٹنہ (بنگال) ڈھاکہ، کلکتہ، پٹنہ میں خاص طور پر کام کرتے تھے۔ امیر خاں، حشمداد خاں (ساکنان پٹنہ) کا چمڑے کا بہت بڑا کاروبار کلکتہ اور پٹنہ میں تھا۔ جن پر اسی پاداش میں ۱۸۷۱ء میں مستقل مقدمہ چلایا گیا اور لاکھوں روپے کا فرم تباہ کر دیا گیا۔

۴۔ تبلیغی رسالے اور جہادی نظمیں بڑی تعداد میں چھاپ کر بانٹی جاتیں۔ مثال کے طور پر مولانا ولایت علیؒ (ف ۱۲۶۹ھ) کے رسالہ 'دعوت' مولوی خرم علی بلہوری (ف ۱۲۶۱ھ) کی مثنوی جہادیہ اور مولانا اولاد حسن قنوجیؒ (ف ۱۲۵۳ھ) کے رسالہ راہ سنت کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ یہ تینوں بزرگ سید صاحبؒ کے خلفاء میں تھے، ان کے علاوہ اس سلسلے کے مختلف بزرگوں ترغیبِ جہاد اور رد بدعات پر جتنے رسالے اور کتابیں لکھیں ان رسالوں کا مفصل ذکر اور مضامین کی تفصیل یہاں ناممکن ہے[2]۔ مثال کے طور پر سنئے:

---

[1] راونشا نے ان خاص ذرائع کی حسبِ ذیل تفصیل دی ہے۔

(الف) مولا بخش (ساکن پٹنہ) محمد شفیع (متہم سازش انبالہ۔ بعد میں وعدہ معاف گواہ) میاں میر کیمپ، لاہور میں۔

(ب) عبدالکریم، (متہم سازش انبالہ۔ بعد میں وعدہ معاف گواہ) شفیع کا ایجنٹ راولپنڈی میں۔

(ج) نبی بخش۔ شفیع کا ایجنٹ (راولپنڈی)

(د) احمد علی (ساکن جگری بہار) پشاور۔

[2] جناب عبداللہ یوسف علی صاحب مترجم قرآن کریم نے اپنی کتاب (انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ ص ۸۹، ۹۰، ۱۸۹) میں اس جماعت کی ان کوششوں کا مختصر ذکر کیا ہے جو اس نے اردو کی اشاعت اور ٹائپ پریس کے قیام کے سلسلہ میں کیں (یعنی تبلیغ کے سلسلہ میں اردو طباعت و اشاعت کی جو بیش قیمت خدمات ضمنی طور پر انجام پا گئیں) آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ ہمارے مترجم قرآن کریم کو یہ بھی خبر نہیں کہ "بدنام وہابی" "حدیثیوں کو کیا درجہ دیتے ہیں؟ مولوی کرامت علی (ف ۱۲۹۰ھ، ۱۸۷۳ء) اور 'وہابیوں' کا فرق بیان کرتے ہوئے رقم فرماتے ہیں: "اور (کرامت علی) حدیث پر یقین رکھتے ہیں جنھیں وہابیوں نے مسترد کر دیا تھا۔" ص ۱۹۲ اللہ رے! سخن فہمی!!

"وہابیوں نے حدیث کو مسترد کر دیا تھا"؟ ہائے رے! بوالعجبی!! کوئی بتلاؤ۔ بتلائیں کیا؟

(الف) مولانا اولاد حسن قنوجیؒ (ف ۱۲۵۳ھ) کے رسالہ ٔ راہ سنت، (مطبوعہ بمبئی ۱۲۸۵ھ، ۱۸۶۸ء) کے آخر میں منظومات اُردو، کا ایک ضمیمہ ہے۔ جن میں ایک نظم کا ایک مصرعہ یہ ہے ع

"خیر خواہ کمپنی مردود ہے"

(ب) رسالہ جہاد میں ایک شعر آتا ہے ؎

فرض ہے تم پہ مسلمانو، جہادِ کفار — اس کا سامان کرو جلد اگر ہو دیندار

(ج) ردِ شرک کے سلسلے میں مولوی خرم علی بلہوریؒ (ف ۱۲۶۰ھ) کی ایک نظم کے یہ شعر ملاحظہ ہوں :۔

خدا فرما چکا قرآں کے اندر — مرے محتاج ہیں پیر و پیغمبر
نہیں میرے سوا طاقت کسی میں — کہ کام آوے تمہاری بے کسی میں
جو خود محتاج ہووے دوسرے کا — بھلا اس سے مدد کا مانگنا کیا الخ

۵۔ صادق پور کے بڑے مکان میں جو 'قافلہ' کے نام سے مشہور تھا۔ جہاد کے رضا کار بنگال سے آتے ہوئے کچھ دنوں قیام کرتے اور وہاں ناظم جماعت کے مواعظ سے مستفید ہوتے۔ جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے، یہ واعظ مولانا ولایت علیؒ (ف ۱۲۶۹ھ) اور ان کی عدم موجودگی میں ان کے چھوٹے بھائی مولانا فرحت حسین (ف ۱۲۷۴ھ) ہوتے، اور موخر الذکر کے انتقال کے بعد مولانا یحییٰ علی (ف در انڈمان ۱۲۸۴ھ، ۱۸۶۸ء) یہ خدمت انجام دیتے۔ یہ سلسلہ باضابطہ طور پر ۱۲۸۰ھ، ۱۸۶۴ء تک جاری رہا۔ جب کہ سازش کا پہلا مقدمہ شروع ہوا۔ صادق پور کا "قافلہ" والا مکان (جہاں اس وقت پٹنہ سٹی میونسپلٹی کی عمارت ہے۔) بہت وسیع تھا اور وہاں بیک وقت سینکڑوں آدمی مقیم ہوتے۔ قافلہ کے مواعظ کے علاوہ نمونہ[۱] کی جامع مسجد میں شاہ محمد حسین صاحبؒ (جنھوں نے خود اپنے

---

[۱] پٹنہ کا ایک محلہ۔ قدیم شہر عظیم آباد (موجودہ پٹنہ سٹی) اور موجودہ بانکی پور کے درمیان آج بھی یہ مسجد آباد ہے۔ کوئی سوا سو برس سے یہ مسجد اہلِ صادق پور کے نظم و اہتمام میں ہے اور اس پوری مدت میں چار پانچ سے زیادہ

صرف سے اُس مسجد کی توسیع کی تھی) کا ہر ہفتہ نمازِ جمعہ کے بعد وعظ ہوتا۔ ان کے مرید اطراف و اکناف سے آکر جمع ہوتے۔ زنانہ مکان میں آپ کا الگ وعظ ہوتا۔ "مقدماتِ سازش" کی کارروائیوں میں تمنو بیہ کی مسجد کا ذکر کثرت سے آتا ہے۔ اور اس سے پتہ لگتا ہے کہ بہتیرے "رضا کار" انہیں مواعظ کی حرارت سے اپنے دلوں کی انگیٹھیاں گرم کرتے۔

یہ تنظیم جماعت کا مختصر خاکہ تھا جو صحیح ترین معلومات کی بنیاد پر عرض کر دیا گیا۔ غیروں کی نگاہ میں اس کی کیا وقعت تھی؟ اس کا بھی مختصر بیان ملاحظہ کر لیجیے۔ گو ان کے بیانات مبالغے سے خالی نہیں۔

"سر ہربرٹ اڈوارڈس SIR HERBERT EDWARDS جنھوں نے پہلے مقدمہ سازش (انبالہ ۱۲۸۰ھ، ۱۸۶۴ء) کی سماعت کی تھی۔ ان "خطرناک لوگوں" کے متعلق فرماتے ہیں:-

> "غداری اور بغاوت کے ایک مرکزی دفتر کا وجود پٹنہ میں بیان کیا جاتا ہے — یہ مولوی امتیاز، علم اور اپنے شہر میں اہمیت کے مالک ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے پاس خاندان کے مختلف ارکان کے متعدد وسیع مکانات، بزرگوں کے مقبرے اور طالب علموں اور مریدوں کی ضیافت کے لئے ایک 'قافلہ' ہے۔[۱]"

اسی طرح پٹنہ سشن کورٹ کے جج مسٹر W. AINSLIE جنھوں نے دوسرے[۲]

(امام) نہیں ہوئے۔ آج کل مولانا حکیم عبدالخبیر صاحب صادق پوری (خلف مولانا حکیم عبدالحکیم صاحب و نبیرہ مولانا احمد اللہ صاحب) ہیں۔ مسلسل پچیس تیس سال سے خطبہ و امامت کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

[۱] ٹیلر TAYLOR کی کتاب ہندوستان میں اڑتیس سال THIRTY EIGHT YEARS IN INDIA جلد ۲، ص ۵-۲۸۴ مطبوعہ لندن ۱۸۸۲ء

[۲] خلیفہ حضرت سید شہید متوفی ۱۲۷۶ھ

مقدمہ سازش (پٹنہ ۱۲۸۱ھ، ۱۸۶۵ء) کی سماعت کی تھی، فرماتے ہیں :-

"اس طرح سے یہ ثابت ہے کہ یہ لوگ مشرقی بنگال میں جہاد کی تبلیغ کرتے اور آدمی اور روپے اس کے لئے جمع کرتے تھے۔ وصول شدہ رقم پٹنہ جاتی اور" اشخاص پٹنہ ہوکر گذرتے۔ یہاں وہ عبدالرحیم مولانا عبدالرحیمؒ کے گھر میں ٹھہرتے، اور مولوی یحییٰ علیؒ (متہم سازش انبالہ : ۱۸۶۴ء) انہیں بغاوت کی تلقین کرتے ___ عبدالغفور (متہم سازش انبالہ) انہیں روپے فراہم کرتا تھا۔ تھانیسر میں محمد جعفر (متہم سازش انبالہ، ۱۸۶۴ء) ان کا استقبال کرتا تھا۔ اور آگے سفر کے لئے زادراہ فراہم کرتا۔ یہ ستھانہ جاتے اور وہاں باغیوں کے ساتھ شریک ہوجاتے، جو وہاں کافی تعداد میں تھے۔ ان کا سرغنہ احمد اللہ (مولانا احمد اللہ۔ متہم سازش پٹنہ : ۱۸۶۵ء) تھا۔ الخ" (کلکتہ گزٹ ۲۰ ستمبر ۱۸۶۵ء)۔

یہ آخری فقرہ قصداً بڑھایا گیا ہے۔ ورنہ واقعہ یہ ہے کہ مولانا یحییٰ علیؒ (ف ۱۲۸۴ھ، ۱۸۶۸ء) اور مولانا عبدالرحیمؒ (ف ۱۳۴۱ھ، ۱۹۲۳ء) کی گرفتاری تک (۱۲۸۰ھ، ۱۸۶۴ء) مولانا احمد اللہ (ف ۱۲۹۸ھ، ۱۸۸۱ء) اس "کاروبار" سے بالکل الگ رہے۔ گرفتاریوں کے بعد انھوں نے اس 'کام' کو اپنے ہاتھ میں لیا۔

اس تحریک کے اصلی کارکنوں کی سیرت اور کام کے متعلق ان کے سب سے بڑے دشمن کی شہادت قابلِ غور ہے۔

"امام نے ۱۸۲۱ء میں پٹنہ کے خلفاء کا انتخاب کرتے وقت ایسے آدمیوں کا انتخاب کیا جو بے پناہ جوش و خروش کے مالک اور انتہائی مستقل مزاج تھے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ متعدد بار جب یہ تحریک دم توڑتی نظر آتی تھی، کس طرح انھوں نے از سر نو جہاد کا جھنڈا بلند کیا اور تحریک کو تباہ ہونے سے بچا لیا۔ پٹنہ کے خلفاء جو ان تھک مبلغ، اپنی ذات سے بے فکر اور بے داغ زندگی بسر کرنے والے تھے، انگریز کافروں کی حکومت کے اکھاڑ پھینکنے میں ہمہ تن مصروف اور روپیہ اور رنگروٹ کی فراہمی کے لئے ایک مستقل نظام کرنے میں نہایت ہی ہوشیار تھے۔ اصل میں

یہ اپنی جماعت کے لئے نمونہ اور مثال تھے۔ ان کی تعلیمات کا بڑا حصّہ بے عیب تھا اور یہ انہ
کا کام تھا کہ انہوں نے اپنے ہم وطنوں کی ایک بڑی تعداد کو پاک زندگی بسر کرنے اور اللہ
کے متعلق بہترین تصور پیدا کرنے کی ترغیب دی۔"[1]

بنگال کے دیہاتوں میں مجاہدین کی تنظیم خاص طور پر قابلِ رشک تھی۔ اس سلسلے م
ہنٹر صاحب کی شہادت ملاحظہ ہو:۔

"بے شمار باغیانہ لٹریچر، پٹنہ کا مرکزی دار الاشاعت اور بنگال کے طول وعرض میں پھیلے ہوئے مبلغین کے علاوہ، باغیانہ رجحان رکھنے والے عوام تک پہنچنے کے لئے ان لوگوں نے ایک چوتھی راہ بھی نکال رکھی تھی۔ ابتدار ہی میں خلفائے نے اس بات کی حوصلہ افزائی کی تھی کہ جہاں کہیں بھی ان کے مریدین ہاتھ بٹائیں، مبلغین کو چاہیئے کہ وہاں مستقل نوآبادی قائم کرلیں۔ اس طرح بنگال کے دیہاتی علاقوں میں متعدد باغیانہ نوآبادیاں قائم ہوگئیں۔ بغاوت کے یہ ضلع وار مرکز پٹنہ کے مرکز سے باقاعدہ خط وکتابت رکھتے تھے۔ ہر مرکز روپیہ اور آدمیوں کی فراہمی کا مکمل نظام رکھتا۔"[2]

"مگر وہابی اپنی طاقت واثر کے لئے کسی ایک طبقے کے دست نگر نہیں، خواہ وہ کتنا ہی مالدار اور طاقت ور کیوں نہ ہو، وہ نہایت دلیری کے ساتھ عوام کو خطاب کرتے ہیں۔ ان کا مذہبی یا سیاسی نظام ایک انقلاب پسند آبادی کے مزاج کے عین مطابق ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے بھی ذکر کیا ہے اور پھر بڑی خوشی کے ساتھ اعلان کرتا ہوں کہ ان میں ہزاروں ایسے مخلص اور متقی آدمی ہیں، جو نفس کشی اور قربانی کو زندگی کا اولین فریضہ سمجھتے ہیں۔ یہی افراد اصل میں جماعت کی برتری کا باعث ہیں۔ ۔ ۔ ۔ بہترین وہابی وہ ہے، جو نہ کسی سے

---

[1] انڈین مسلمانز: ص ۶۰

[2] انڈین مسلمانز: ص ۷

ڈرے اور نہ کسی پر رحم کھائے (۹) اس کی زندگی کی شاہ راہ بالکل صاف ہے۔ کسی قسم کا تشدد یا تنبیہ اسے اپنے راستہ سے نہیں ہٹا سکتی۔"[۱]

ان قسم کے ایک ممتاز کارکن کا ذکر ان الفاظ میں آیا ہے :۔

"مالدہ کا انچارج امیر الدین عبدالرحمٰن دیہاتوں میں تحریک کی تبلیغ کرتا رہا۔ اور رضا کاروں کے ساتھ ساتھ زکوٰۃ و صدقات کی رقمیں بھی مجاہدین کی امداد کے لئے سرحدی علاقوں میں جاتی رہیں۔ اس طرح بنگال کے تمام علاقوں میں چندہ اور رضا کاروں کی فراہمی کے لئے شاخیں قائم ہیں۔"

یہ ایک واقعہ ہے کہ ہنٹر کی مبالغہ آمیزیوں نے بنگال میں اس 'تحریک' کو ہوّا بنا دیا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ بنگال پر جس سفید فام صاحب قلم نے کچھ لکھا، وہ اس 'کابوس' سے متاثر رہا۔ مردم شماری کی رپورٹیں بھی اس "روگ" سے خالی نہیں۔ ۱۹۰۱ء اور ۱۹۱۱ء کی رپورٹوں کے مقدمہ نگار نے 'وہابی تحریک' پر اچھی خاصی بحث کی ہے اور اس کی فراہم کردہ معلومات تقریباً سب کی سب راونشا، اوکنلے اور ہنٹر (ماہرین "وہابیات") کے بیانات سے ماخوذ ہے۔ بہرحال اندازہ کے لئے ۱۹۱۱ء کی مردم شماری کی 'رپورٹ' سے 'نظام عمل' کے متعلق ایک اقتباس پیش ہے :۔

"اس پوری مدت (۱۸۳۱ء - ۱۸۶۸ء) میں پٹنہ سازش کا مرکز تھا۔ وہابی مبلغ ہندوستان اور دوسرے قریب کے ملکوں میں اپنے مشن کی تبلیغ کر رہے تھے۔ ان کے بڑے لیڈر ولایت علی اور عنایت علی پٹنہ کے رہنے والے تھے۔ ولایت علی نے بنگال کا دورہ کیا۔ پھر بمبئی، حیدرآباد اور صوبہ جات متوسط میں گشت کرتے رہے۔ اور انہیں علاقوں کو اپنی دعوت کا مرکز قرار دیا۔ عنایت علی نے بنگال کے اضلاع مالدہ، بوگرا، راجشاہی، پبنہ، ندیا اور فرید پور میں اپنی کوششیں صرف کیں۔ . . . ولایت علی کے

---

[۱] انڈین مسلمانز : ص ۱۰۳ - ۱۰۲

خلیفہ زین العابدین حیدر آبادی نے چھپرا اور سلہٹ (آسام) میں کام کیا۔ معمولی مبلغوں کا کیا ذکر، کہ ان کی تعداد بے شمار تھی۔ اس طرح پر ان کے مبلغ چپہ چپہ میں پھیل گئے۔ گاہے گاہے پٹنہ سے ہدایات ملتی رہتی تھیں جس سے تحریک کی عملیت میں فرق نہیں آنے پاتا۔"[1]

ان اقتباسات کا سلسلہ دراز کیا جا سکتا ہے۔ مگر ایک ہی بات کے بار بار دہرانے میں کوئی خاص فائدہ نہیں نظر آتا۔ اُردو میں مولوی طفیل احمد صاحب نے اپنی کتاب (مسلمانوں کا روشن مستقبل) میں کچھ اقتباسات دیے ہیں، مگر ان کا ماخذ ہنٹر کی رسوائے عالم کتاب ہے، اور ہنٹر کا زیادہ تر بھروسا راونشا THE REVENSHAW اور جیمس اوکنلے JAMESOKINELY پر ہے۔ اور ان دونوں کی تحریروں کے نمونے دیے جا چکے۔ امپیریل گزیٹر (بابت ضلع پٹنہ) میں بھی ہنٹر صاحب کی روح کارفرما ہے۔

فرہنگِ مصطلحات

اس سلسلے کی ایک اور دلچسپ چیز کا ذکر کرنا ناظرین کی ضیافتِ طبع کا باعث ہوگا۔ مجاہدین اپنی خط و کتابت میں قسم قسم کی "سمجھی بوجھی" اصطلاحات خفیہ لغت کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ تاکہ "کراماً کاتبین" کو شبہ نہ ہو۔ مگر ان لال بجھکڑوں نے بھی آخر پتہ لگا ہی لیا۔ مجاہدین کے سب سے بڑے کرم فرما مسٹر راونشا نے اپنی یادداشت میں ان اصطلاحی لفظوں کی ایک "فرہنگ" دی ہے — جسے کچھ تفریح اور کچھ "تاریخ" کی خدمت کے خیال سے ہم یہاں درج کر دینا مناسب خیال کرتے ہیں۔ البتہ اتنا ملحوظ رہے کہ ان کا حرف بہ حرف صحیح ہونا یقینی نہیں، کہ یہ لوگ مبالغہ بہت کرتے ہیں:۔

جہادی، خدمت گار، بیوپاری مسافر، سانڈ	جنگ کے رنگروٹ
قافلہ	رنگروٹوں کا جتھا

---

[1] مردم شماری کی رپورٹ ۱۹۱۱ء: جلد ۵، ص ۲۴۸-۲۴۶

بڑا گودام	ملکا ستھانہ
چھوٹا گودام	پٹنہ
مقدمہ	جنگ
منحنا	اللہ
سفید پتھر	ہنڈی
کتابوں کی قیمت	نقد رقمیں

قافلہ — صادق پور کے مولویوں کے مکان کا احاطہ خاص کر وہ مکان جس میں مولوی ولایت علی اور عبدالرحیم رہا کرتے تھے۔

۱۸۷۱ء کے مقدمہ سازش میں عبدالغفور متہم وسزا یافتہ مقدمہ سازش انبالہ ۱۸۶۴ء جو بعد میں وعدہ معاف گواہ بن گیا تھا، اور اس کی سزا حبسِ دوام بعبور دریائے شور سے گھٹا کر دس سال کر دی گئی تھی، نے بھی اپنی "شہادت" کے سلسلے میں بعض "مصطلحات" کا ذکر کیا ہے جو اسی کے لفظوں میں درج کیے جاتے ہیں:

"(وکیلِ صفائی مسٹر INGRAM کے جرح کے جواب میں) جوتوں SHOES سے روپے مراد ہیں۔ اسی طرح کتابوں سے بھی مجھے نہیں معلوم کہ کسی شہر کا بھی کوئی فرضی نام تھا۔ گلشن اس جگہ کا نام ہے، جہاں عبداللہ (مولانا عبداللہ، امیر الجہاد) رہتے تھے۔ یحییٰ علی (مولانا یحییٰ علی، متہم سازش انبالہ) نے مجھ سے بیان کیا کہ بابو صاحب سے مراد عبداللہ ہیں . . . . جوتوں سے آدمی بھی مراد ہو سکتے ہیں۔ موقع کے لحاظ سے کتابوں سے آدمی اور روپے دونوں مراد ہوتے تھے۔ نوکروں سے مجاہدین بھی مراد ہوتے تھے۔"[1]

راونشا کے نقشِ قدم پر ایک دوسرے ماہر قانون نے بھی "فرہنگ مصطلحات" میں کچھ قیمتی اضافے کیے ہیں۔ ناقدری ہوگی اگر ان کی تحقیقات سے ناظرین کو محروم رکھا جائے۔

---

[1] وہابی ٹرائل؛ ص ۶۲

یہ صاحب مسٹر اینسلی W. AINSLIE پٹنہ کے سشن جج ہیں، جنھوں نے مقدمہ سازش پٹنہ (۱۸۶۵ء) کی دوسری سماعت کی تھی۔ (پہلی سماعت خود مسٹر راونشا نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی حیثیت سے کی تھی) یہ اپنے "فیصلے" کے آغاز ہی میں ترتیب ذیل سے 'جعلی' اور اصلی ناموں کی فہرست دیتا ہے۔ اور اس نے ہر نام کے ساتھ "ثبوت" کے گواہ یا گواہوں کے نام بھی دئے ہیں، جسے ہم طوالت کے خوف سے نظر انداز کرتے ہیں:۔

اصلی نام	جعلی نام
یحییٰ علی	محی الدین
فیاض علی[۱]	بشیر الدین
مولوی عبداللہ	بابو صاحب

اصلی نام	جعلی نام
مولوی عبداللہ	بابوجان۔ میاں جان
محمد شفیع	شفاعت علی
عبدالرحیم	رحیم بیگ
محمد جعفر	پیرو خاں۔ پیرو خلیفہ

---

[۱] مولانا فیاض علی (مولود تقریباً ۱۲۳۵ھ) مولانا احمد اللہ (ف ۱۲۹۸ھ) اور مولانا یحییٰ علی (ف ۱۲۸۴ھ) کے سگے بھائی تھے، مولانا احمد اللہ سے چھوٹے اور مولانا یحییٰ علی سے بڑے، مولانا ولایت علیؒ سے بیعت تھے اور ہمیشہ ان کے ساتھ رہے۔ پھر آخر میں صوات نُبیری کو اپنا مستقر بنالیا اور وہیں غربت و ہجرت کے عالم میں وفات پائی۔ کوشش کے باوجود ٹھیک سنہ وفات نہ معلوم ہو سکا۔ راونشا نے آپ کا نام ان لوگوں کی فہرست میں دیا ہے جو ۱۲۸۱ھ، ۱۸۶۵ء میں مولوی عبداللہ (ف ۱۳۲۰ھ) کے ساتھ ملکا، ستھانہ کے جہادیوں میں شامل تھے۔

عبدالقادر
احمداللہ
محمد احسان[1]
عبدالرحیم کا گھر
ملکا ۔ ستھانہ
پٹنہ

غلام قادر
احمد علی
روح اللہ
قافلہ، قافلہ گاہ
بڑا گودام
چھوٹا گودام

---

[1] یہ لوگ کہتے ہیں کہ مولانا یحییٰ علی کے صاحبزادے کا نام احسان تھا۔ یہ غلط ہے۔ ان کا نام محمد عیسیٰ تھا، جو بعد میں شمس العلماء مولانا امجد علی ایم۔ اے کے نام سے مشہور ہوئے۔ ان پر وارنٹ تھا، اس لئے نام بدل لیا تھا۔ یہ بھی غلط ہے کہ ان کے کوئی صاحبزادے امبیلا میں شہید ہوئے۔

چھٹا باب

سازش کا الزام اور مقدمے

یہ پہلے کہیں گذر چکا ہے کہ کمپنی کی حکومت نے پہلے پہل "مجاہدین" کے آنے جانے میں کوئی روک ٹوک نہیں کی، ہنٹر ایک جگہ لکھتا ہے کہ بعض کارخانوں کے مسلمان ملازم اپنے انگریز مالکوں سے چھٹی لے کر جہاد کو جایا کرتے تھے۔[۱] سر سید نے ایک اور دلچسپ واقعے کا ذکر کیا ہے :-

دہلی کے ایک ہندو مہاجن نے جس کے پاس "جہادیوں" کی امدادی رقمیں جمع تھیں، کچھ غبن کیا تو مولانا شاہ محمد اسحاق رح[۲] نے مسٹر ولیم فروزر WILLIAM FROZAR کمشنر دہلی کے اجلاس میں نالش کی اور مدعی کے حق میں ڈگری ہوئی۔ وصول شدہ رقم پھر دوسرے ذریعہ سے سرحد کو بھیجی گئی۔ اس مقدمے کی اپیل صدر کورٹ الہ آباد میں ہوئی وہاں بھی عدالت ماتحت کا فیصلہ بحال رہا۔[۳]

شاہ محمد اسحاق صاحب ۱۲۵۸ھ، ۱۸۴۲ء میں مکہ معظمہ ہجرت کر گئے تھے۔ اس لیے یہ

---

۱ ہنٹر کی کتاب (ہندوستانی مسلمان) کا جواب از سرسید (ص ۲۳-۲۲)

SIR SAYEDAHMAD ON DR. HUNTERS مطبوعہ لندن ۱۸۷۲ء

۲ انڈین مسلمانز: ص ۱۲ OUR INDIAN MUSSALMANS

۳ مولانا شاہ محمد اسحاق صاحب، شاہ عبد العزیز کے نواسہ تھے ۱۲۵۸ھ، ۱۸۴۲ء میں مکہ معظمہ کو ہجرت کر گئے تھے۔ اور وہیں ۱۲۶۲ھ، ۱۸۴۶ء میں وفات پائی۔ رحمۃ اللہ و نور ضریحہ

واقعی طور پر ۱۸۴۲ء سے پہلے کا ہے — کہنا یہ ہے اور صاف صاف کہ جب تک "مجاہدین" سکھوں سے الجھے رہے، کمپنی کی حکومت خاموش اور غیر جانبدار[1] رہی۔ "سانپ مرے اور لاٹھی نہ ٹوٹے"، پر ترکوں نے نجد میں عمل کیا تھا (ملاحظہ ہو اس رسالے کا پہلا باب)، اُن کے استادوں نے اس فارمولے پر یہاں عمل کیا۔ مقصود یہ تھا کہ مجاہدین اور سکھوں کی آویزش میں سرکارِ عالی کا کچھ نہ کچھ فائدہ ہی رہے گا۔ لیکن جونہی پنجاب کا الحاق عمل میں آیا (۱۲۶۵ھ، ۱۸۴۹ء) کمپنی اور سرکار کی نظر میں مجاہدین سے بُرا کوئی نہیں تھا۔ پھر کوئی کسر نہیں تھی جو ان کے کچلنے کے لئے اٹھا رکھی گئی ہو۔ اس سلسلے میں حکومت نے جو تعزیری کارروائیاں کیں، ان میں مقدماتِ سازش کا نام سرِ عنوان آتا ہے۔ یہ مقدمے ۱۲۸۰ھ، ۱۸۶۴ء سے لے کر ۱۲۸۷ھ، ۱۸۷۱ء تک ملک کے مختلف حصوں میں دائر کیے گئے۔ زیرِ نظر سطروں میں ان ہی مقدمات کا اجمالی ذکر کیا جاتا ہے۔

پہلا مقدمہ سازش انبالہ ۱۲۸۰ھ، ۱۸۶۴ء

یہ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ بدنام دوہابی، مبلغ اپنا کام، اس طرح انجام دیتے تھے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ مگر ۱۸۵۸ء کی فوجی مہم نے اس راز کا انکشاف کیا کہ سرحدی مقتولوں[2] میں ایسے لوگوں کی بڑی تعداد ہے جو رنگ روپ میں پوربی (بنگال و

---

[1] موجودہ برطانوی ہند کے مشہور تاریخ داں ڈاکٹر شفاعت احمد خاں، اپنے ایک خطبے میں (جو انھوں نے جون ۱۹۳۹ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کی صد سالہ برسی کے موقع پر ارشاد فرمایا تھا) کہتے ہیں کہ سرکار کمپنی کی یہ محتاط (SCRUIOUS) اور "غیر جانبدارانہ روش" اصولی طور پر TECHNICALLY بالکل درست تھی (روزنامہ لیڈر LEADER الہ آباد۔ مورخہ ۳۰ جون ۱۹۳۹ء)

[2] شہدا کی لاشوں کے علاوہ گھر کے بعض رئیسوں نے بھی خبر رسانی کی اور اسرارِ سربستہ کے انکشاف اور تحلیل میں حصہ لیا۔ نیز شہر کے بعض رئیسوں نے بھی خیر خواہی کا حق ادا کیا۔ خاقانی ہند حکیم عبد الحمید عظیم آبادی (۱۲۴۵ھ، ۱۳۲۳ھ) خلف مولانا احمد اللہؒ نے اپنی مثنوی شہر آشوب میں "گھر کے بھیدیوں" کا ڈرڈر کر ذکر کیا ہے۔ اس کے دو شعر عرض ہیں:-

دل شان پر ز بغی و شر و فساد | متفق گشتہ جمعے از حساد!
زاد اللہ فی القلوب مرض الخ | فرقہ طامعانِ اہلِ عرض

بہار) کے باشندے معلوم ہوتے ہیں[1]

۱۲۸۰ھ، ۱۸۶۳ء کی مہم امبیلا کے بعد سرکار برطانیہ کو اور کد ہوئی۔ گو اس سے پہلے بھی، بلکہ الحاق پنجاب (۱۲۶۵ھ، ۱۸۴۹ء) کے بعد ہی سے حکومت کی نگاہ ان لوگوں پر تھی[2]۔ مگر اس "سازش" کا حقیقی انکشاف ایک ولایتی افغان غزن خاں نامی نے کیا۔ راونشا صاحب[3] فرماتے ہیں :۔

مئی ۱۸۶۳ء کو چار بنگالی انبالہ جاتے ہوئے ضلع کرنال میں ایک سوار پولیس سرجنٹ غزن کے ہاتھ گرفتار ہوئے۔ غزن خاں یوسف زئی علاقے کا باشندہ ہے۔ اس نے چاروں بنگالیوں کو شکل و شباہت میں ان لوگوں کے مشابہ پایا، جو برطانوی فوج کے ہاتھوں ستھانہ والی لڑائی میں گرفتار ہوئے تھے۔ یہ بنگالی مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیے گئے۔ لیکن بعد میں رہا کر دیے گئے۔ . . . . غزن خاں نے اپنے بیٹے کو ملکا بھیجا اور یہ دریافت کرایا کہ پہاڑ کے جہادیوں کی اشخاص اور اسلحہ سے مدد مولوی جعفر تھانیسری کے ذریعہ ہوتی ہے۔ یہ اطلاع انبالہ کے ضلع سپرنٹنڈنٹ پولیس کیپٹن پارسن Q.D. PARSON کو دی گئی۔ جنھوں نے تفتیش شروع کی الخ

یہ روایت اور اس مقدمے کی اکثر تفصیلات راونشا اور اس کے شاگرد رشید ہنٹر نے تقریباً ٹھیک بیان کی ہیں۔ مولوی محمد جعفر صاحب تھانیسری نے اپنی کتاب تواریخ عجیب میں اس مقدمے کی پوری روداد قلم بند کر دی ہے، جو اپنے بیان کی سادگی اور پرکاری کے لحاظ سے پڑھنے کے قابل ہے۔ یہاں سازش کے انکشاف سے متعلق مولوی محمد جعفر صاحب

---

[1] انڈین مسلمانز: ص ۸۵ [2] راونشا نے ۱۸۵۲ء (۱۲۶۷ھ) کے ایک دستے 4th REGIMENT OF NAHVE INFANTRY کے اندر "جہادی سازباز" کا ذکر کیا ہے۔ نیز اسی کے بیان کے مطابق اس رجمنٹ کے منشی محمد ولی پر مقدمہ چلایا گیا اور وہ سزایاب ہوا (۱۲ مئی ۱۸۵۳ء، شعبان ۱۲۷۰ھ) مولویوں کا نام بھی بار بار فراہمیٔ رسد کے سلسلے میں آیا (کلکتہ گزٹ ۲۰ ستمبر۔

[3] کلکتہ گزٹ ۲۰ ستمبر ۱۸۶۵ء، ہنٹر نے بھی اس کے بیان پر اعتماد کیا ہے۔

کی تحریر بھی ملاحظہ کر لی جائے، تاکہ سرکاری "ماہرینِ فن" اور ایک مبتلائے محن کے بیانات کا مقابلہ کر کے 'بین السطور' مفہوم اخذ کیا جا سکے:۔

"... ایسے نازک وقت اور گھما گھمی کے ایام میں (یعنی امبیلا کی مہم میں سرکاری فوج کی تباہی کے دنوں میں) ۱۱ر دسمبر ۱۸۶۳ء مطابق ۲۸ر جمادی الثانی ۱۲۸۰ھ کو ایک سوار پولیس متعینہ چوکی پانی پت ضلع کرنال مسمی غزن خاں نام ایک ولایتی افغان نے کسی ذریعہ سے میرے حال سے واقف ہو کر اور ایسے وقت میں اپنی دنیوی بھلائی کا موقع جان کر ایک بڑی لمبی چوڑی کیفیت خیر خواہانہ (؟) کے ساتھ بحضور صاحب ڈپٹی کمشنر کرنال کے حاضر ہو کر یہ مخبری کی کہ یہ جنگ جو ہندوستانی "قافلہ" (فافہم) والوں کے ساتھ سرحد پر ہو رہا ہے (کذا) ان لوگوں کو محمد جعفر نمبردار تھانیسر روپیہ اور آدمیوں سے مدد دیتا ہے۔ خیر ڈپٹی کمشنر کرنال نے یہ داستان سن کر بذریعہ تار برقی ضلع انبالہ کو کہ جس کی حدود اراضی کے اندر ہمارا شہر واقع ہے خبر بھیج دی" (ص ۳)

جب داستان چھڑ گئی ہے تو اس روداد الم کا ایک دلچسپ باب اور ملاحظہ کر لیجئے:۔

"ادھر مخبر مخبری کر کے نکلا تھا کہ اُدھر ہمارے ایک دوست ڈپٹی کمشنر صاحب کرنال کی ملاقات کو ان کے بنگلے پر پہنچے۔ جن سے عند التذکرہ صاحب موصوف نے ذکر اس مخبری کا بھی کیا۔ جب بعد انفراغ ملاقات یہ صاحب اپنے ڈیرے کو تشریف لائے تو انہوں نے مسمی کا وا نام ایک اپنے نوکر سے جو میرا ہمسایہ تھا، بطور افسوس حال اس مخبری کا بیان کیا۔ کا وا مذکور یہ حال سن کر اسی وقت اس کی خبر کرنے کو تھانیسر دوڑ پڑا۔ لیکن خوبیٔ تقدیر سے کچھ نہ زیادہ رات گئے یہ شخص تھانیسر میں پہنچا اور سب سے پہلے میرے مکان پر آیا۔ مگر میں اس وقت گھر کے اندر سو رہا تھا۔ وہ اس وقت رات کو ہمارا دروازہ بند اور ہم کو سوتے دیکھ کر ایسے آرام کے وقت ہم کو تکلیف دینا مناسب نہ جان کر اپنے دل میں سوچا کہ

مخبر کو خبر کر دوں گا۔ اِدھر تقدیر اس کو تو دروازے پر سے ہٹالے گئی، اب اُدھر انبالہ کی کیفیت سنئے۔ جب انبالہ میں یہ تار خبر پہنچی تو ایک وارنٹ میری خانہ تلاشی کا جاری ہوا اور کپتان پارسن صاحب ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس ایک جماعتِ کثیر پولیس کی لے کر راتوں رات میرے مکان پر پہنچے۔[۱] (ص ۳-۴)

پھر کیا ہوا؟ اس کی تفصیلی سرگزشت تواریخ عجیب سے معلوم ہوگی۔ ہنٹر نے بھی اپنی کتاب میں اس مقدمے کی تفصیلات دی ہیں۔ اس لئے ہم یہاں دورانِ مقدمہ کی تفصیلی کارروائیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے صرف ضروری باتیں ذکر کرنے پر اکتفا کرتے ہیں:۔

اس مقدمہ میں کُل گیارہ ملزم[۲] تھے، جن کے نام درج ذیل ہیں:۔

۱۔ مولانا یحییٰ علی جعفری صادق پوری عمر ۴۲ سال۔

راونشا نے ان کا عہدہ "امیر الواعظین" بتایا ہے۔ اصل میں یہ نظم جماعت کے ذمہ دار تھے۔ انہیں "سرغنہ" کے لقب سے بھی یاد کیا گیا ہے اور بجا طور پر۔

۲۔ مولانا عبدالرحیم صادق پوری۔ عمر ۲۸ سال تقریباً سولہ سال جزائر انڈمان میں رہ کر ۱۳۰۰ھ، ۱۸۸۲ء میں رہا ہوئے اور بڑی عمر پا کر ۱۳۴۱ھ، ۱۹۲۳ء میں وفات پائی۔

۳۔ منشی محمد جعفر تھانیسری۔ عمر ۲۸ سال، ساکن تھانیسر ضلع انبالہ تمام اسیرانِ بلا میں یہ سب سے زیادہ ہوشیار اور معاملہ فہم تھے۔ پورے مقدمے کے دوران میں انہوں نے کوئی وکیل نہیں مقرر کیا اور بڑی قابلیت کے ساتھ گواہوں پر جرح کی۔ مولوی عبدالرحیم صاحب کے ساتھ یہ بھی رہا ہوئے اور ایک عرصہ آزاد رہ کر ۱۹۰۵ء میں رحلت کی ___ سید صاحبؒ کے ماننے والوں کی جماعت میں یہی ایک ذمہ دار آدمی ایسے ہیں، جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں شرکت کی تھی۔[۳]

---

[۱] پارسن نے اپنی شہادت میں خانہ تلاشی کی تاریخ ۱۲ر دسمبر ۱۸۶۳ء بتائی ہے (وہابی ٹرائل: ص ۶۵)

[۲] گرفتاری تو بہتوں کی ہوئی مگر ملزم صرف گیارہ آدمی قرار دیے گئے، کچھ لے دے کر چھوڑ دیے گئے اور بعضوں نے سرکاری گواہ بن کر رستگاری حاصل کی۔

[۳] یہ بھی ہنٹر کا بیان ہے اور دوسرے ذرائع سے اس کی تصدیق نہیں ہو سکی۔

۴۔ میاں عبد الغفار۔ ساکن (پٹنہ) راونشا نے ان کا نام "عبد الغفور ولد منگو قوم کوری عمر ۲۵ سال۔ ملازم ملزم ۷ ۸" (یعنی مولانا عبد الرحیم) لکھا ہے۔ وہ کیا جانے کہ روسار صادق پور اس "ملازم" کا "آقا" سے بڑھ کر احترام کرتے تھے۔ یہ بزرگ امی محض تھے۔ مولانا ولایت علیؒ (ف ۱۲۶۹ھ) کے خادم تھے۔ مولانا فرحت حسینؒ (ف ۱۲۷۷ھ) اور مولانا یحییٰ علیؒ (ف ۱۲۸۴ھ) سے تربیت حاصل کی۔ مولوی عبد الرحیم صاحبؒ کے ساتھ انڈمان سے واپس ہوئے۔ کوئی تیس برس ہوئے کہ ان کا انتقال ہوگیا۔ خود مولانا عبد الرحیم اور تمام متاخرین علمائے صادق پور انہیں سیدی میاں عبد الغفار کہا کرتے۔ صحیح تاریخ وفات نہ معلوم ہوسکی (ف تقریباً ۱۳۳۳ھ)

۵۔ قاضی میاں جان، ساکن کمر کلی COMMERCOLLY ضلع پتبہ (بنگال) عمر ۶۰ سال انبالہ جیل ہی میں وفات پائی۔ انبالہ کے جج کے بیان کے مطابق مراسلات کا سب سے زیادہ باغیانہ حصہ انہیں کے گھر پر پایا گیا۔[1] شہادتوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ متعدد ناموں سے مشہور تھے۔ ان کے بھائی قاضی مراد علی نے ان کے خلاف شہادت دی۔ اسی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی جائداد ضبط کر لی گئی تھی۔ اور قاضی مراد کو شہادت کے معاوضے میں انعام بھی ملا تھا۔[2]

یہ پانچ بزرگ تمام ابتلا و آزمائش میں ثابت قدم رہے اور اپنی ثابت قدمی سے عہدِ صحابہ کی یاد تازہ کردی۔ (اسیرانِ ابتلا کے آلام و مصائب کا ذکر آخر میں آئے گا۔)

۶۔ محمد شفیع انبالوی۔ یہ پیشے کے اعتبار سے قصاب تھا اور فوجی چھاونیوں میں گوشت "سپلائی" کیا کرتا تھا اور لاکھوں روپے کے کاروبار کا مالک تھا۔[3] اس کا مرکز راولپنڈی تھا، اور مختلف چھاونیوں میں اس کے گماشتے مقرر تھے اور ستھانہ کی جہادی چھاونی کو

---

[1] ہنٹر: ص ۹۷-۹۸ [2] وہابی ٹرائل: ص ۲۶

[3] ایک صاحب لکھتے ہیں کہ اس خاندان وارن ہیسٹنگز (۱۷۸۵-۱۷۷۲) کے زمانہ سے گورنمنٹ چھاونیوں کی ٹھیکہ داری کرتا تھا (جرنل بمبئی رائل ایشیاٹک سوسائٹی جلد ۱۴، ص ۲۷۲)

روپے زیادہ تر اسی کے ذریعے سے جانتے تھے۔

اسی لئے پہلے پہل مولانا یحییٰ علیؒ اور منشی محمد جعفر صاحبؒ کے ساتھ اسے بھی پھانسی کی سزا ہوئی تھی۔ بعد میں ان تینوں کی سزا بھی پنجاب جوڈیشنل کمشنر نے "حبس دوام بعبور دریائے شور" سے بدل دی[1] (۲۴ راگست ۱۸۶۴ء) لیکن اول دن ہی سے اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ بعد میں دوسروں کے ساتھ یہ بھی وعدہ معاف گواہ بن گیا تھا ۱۸۶۵ء کے مقدمہ سازش، پٹنہ اور ۱۸۷۱ء کے آخری مقدمہ سازش (پٹنہ) میں اس نے سرکاری گواہ کی حیثیت سے شہادت دی ـــــ کُل دو برس یہ قید رہا۔ لیکن سرکار نے اس کی جائداد ضبط کر ہی لی اور واپس نہ کی۔ مولوی محمد جعفر صاحب کا بیان ہے کہ اس کی جائداد پچاس لاکھ کی مالیت کی ہوگی[2]۔ ہنٹر نے اس کی بہت بُرائی کی ہے، اور جی بھر کر گالیاں دی ہیں۔ یہاں تک کہ سود خواری کا الزام بھی عائد کیا ہے جو بالکل ناروا ہے اور گو محمد شفیع نے ایک مخلص مسلمان کی حیثیت سے اعلیٰ کردار کا ثبوت نہیں دیا، پھر بھی حق و انصاف کی خاطر ہنٹر کے اس ناروا اتہام کی تردید ضروری معلوم ہوئی۔

۷۔ عبدالکریم انبالوی۔ عمر ۳۵ سال۔ یہ محمد شفیع کا مختار تھا، بعد میں اس کا بھانجی داماد

---

[1] اسیرانِ بلا کے کرم فرمائے خصوصی جناب ہنٹر (علیہ ما علیہ) نے سزا کی تبدیلی کی عجیب و غریب توجیہ کی ہے۔ ۔۔۔ ان کا ایمان بہت قوی تھا۔ ۔ ۔ ۔ اور وہ پھانسی کی سزاؤں کے لئے ہر وقت تیار رہتے تھے اسی لئے برطانوی حکام نے ان سے یہ بجا انتقام لیا کہ ان کے بڑے سے بڑے باغی کو بھی درجہ شہادت حاصل کرنے کا موقع نہیں دیا۔ (ص ۹۵)

سبحان اللہ! ہائے! ظالم! تو جہاد و جلا وطنی، قید و مشقت اور سرگردانی و توفیق شہادت کی لذت اور اجرا کا حال کیا جانے؟

ارے! وہاں تو نیتوں کا اجر بھی بے حساب ملا کرتا ہے۔

تو و طوبیٰ و ما و قامت یار	فکر ہر کس بقدر ہمت اوست

[2] تواریخ عجیب: ص ۹۴

بھی ہو گیا تھا۔ محمد شفیع کی طرح اس کے قدم میں بھی شروع ہی سے لغزش تھی۔ یہ بھی محمد شفیع کے ساتھ بعد میں سرکاری گواہ بن گیا تھا ــــ یہ صرف ڈیڑھ سال قید میں رہا۔

۸۔ عبد الغفور ولد شاہ علی خاں ساکن ضلع شاہ آباد۔ بہار (ہزاری باغ بہار۔ حسب روایت مولوی عبد الرحیم صاحب) ــــ عمر ۲۵ سال، یہ تھانیسر میں مولوی محمد جعفر صاحب کے ہاں مقیم تھا۔ اصل میں یہ الٰہی بخش، (ملزم ۱۱) کا ملازم تھا۔ پہلے عبور دریائے شور کی سزا ہوئی۔ پھر دس سال رہ گئی۔ مقدمہ سازش پٹنہ (۱۸۷۱ء) میں یہ بھی سرکاری گواہ تھا۔ ہنٹر اسے عبد الغفار کہتا ہے جو صحیح نہیں۔

۹۔ حسینی ولد محمد بخش۔ عمر ۲۵ سال، تھانیسر۔ یہ مولانا عنایت علیؒ کی زندگی میں شریک جہاد رہ چکا تھا۔ بعد میں جماعت کے کاموں میں مولوی محمد جعفر صاحب کا معاون ہو گیا تھا۔ مقدمہ سازش پٹنہ (۱۸۷۱ء) میں سرکاری گواہ کی حیثیت سے اس کی شہادت ہوئی تھی۔ کُل سات برس یہ قید رہا۔

۱۰۔ حسینی ولد میکھو ساکن پٹنہ۔ عمر ۳۵ سال۔ یہ الٰہی بخش، ملزم ۱۱ کا ملازم تھا۔ یہ دس برس قید رہا۔ ۱۸۷۱ء کے مشہور مقدمے میں اس کی بھی شہادت ہوئی تھی۔

۱۱۔ الٰہی بخش ولد کریم بخش عمر ۴۲ سال۔ یہ مولانا احمد اللہ صادق پوری متہم مقدمہ سازش پٹنہ۔ ۱۸۶۵ء کا مختار تھا۔ اور ارسالِ زر کا زیادہ تر کام اسی کے واسطے سے ہوتا تھا۔ اس کا خود اپنا کاروبار بھی اچھا خاصہ تھا۔ حبسِ دوام بعبور دریائے شور کی سزا ہوئی تھی۔ پھر دوسرے مقدمے (۱۸۶۵ء) میں سرکاری گواہ کی حیثیت سے اس کی شہادت ہوئی۔ اور معاف کر دیا گیا۔

ان اسیرانِ بلا میں صرف مقدم الذکر[۱] پانچ حضرات اخیر تک ثابت قدم رہے۔ جن میں سے

---

[۱] ہنٹر نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "(مولانا) یحییٰ علی کے مریدوں میں سے کسی نے ان کے خلاف شہادت نہیں دی۔" یہ صحیح ہے لیکن امیر خاں کے مقدمے (پٹنہ: ۱۸۷۱ء) میں بہتوں نے شہادتیں دیں، خواہ جس طرح بھی انہیں دبا دھمکا کر تیار کیا گیا ہو۔ ۱۸۷۱ء کے مقدمے کے متعدد گواہوں نے عدالت میں یہ بیان کیا کہ انہیں فلاں صاحب نے شہادت پر آمادہ کیا۔

ایک (قاضی میاں جان) نے سزا پانے کے بعد انبالہ جیل ہی میں وفات پائی (۱۲۸۱ھ، ۱۸۶۵ء) اور وہ . . . . جو ان سب سے ممتاز اور باخدا تھا، دو برس انڈمان میں رہ کر سفرِ آخرت کی راہ لی (۱۲۷۴ھ، ۱۸۶۸ء) میری مراد جناب مولانا یحییٰ علی رحمۃ اللہ علیہ سے ہے، جو اپنے تقویٰ اور اخلاص جہاد کے لحاظ سے دورِ سلف کا نمونہ تھے۔ باقی تین بزرگ زیادہ سخت جان نکلے۔ سیدی میاں عبدالغفار، مولانا عبدالرحیم (ف ۱۳۴۱ھ) اور منشی محمد جعفر صاحب تھانیسری (ف ۱۹۰۵ء) ۱۳۰۰ھ، ۱۸۸۳ء میں انڈمان سے رہا ہو کر وطن واپس آئے۔ اور یہی وہ بزرگ ہیں جنکی زبانی داستانِ قفس اڑتی ہوئی کچھ ہم نا آشنایانِ راہ و رسم منزل تک پہنچی ہے۔ اس ابتلاء و آزمائش کی داستان کا خلاصہ "اسیرانِ بلا کے مصائب" کے ضمن میں عرض کیا جائے گا۔

ان تمام اسیرانِ بلا میں مولانا یحییٰ علیؒ ہر حیثیت سے خاص امتیاز کے مالک تھے۔ انکے مختلف کمالات اور خصوصیات کے بیان کی یہاں گنجائش نہیں۔ سرِ دست انبالہ کے سشن جج سر ہربرٹ ایڈورڈس SIR HERBERT EDWARDS کے ریمارکس، یا تاثرات کا پیش کر دینا کافی ہوگا۔ ہنٹر کی زبان میں "شاید ہی کسی عدالت نے کسی ملزم کے متعلق ایسے مؤثر الفاظ کہے ہوں ـــ سر ہربرٹ سزائے موت کا حکم سناتے ہوئے فرماتے ہیں :-

"یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ گیا ہے کہ یحییٰ علی ہی اس سازش کا کرتا دھرتا ہے، جس کا انکشاف اس مقدمے کے دوران میں ہوا۔ وہ ایک مذہبی واعظ تھا۔ اور انتہائی مقدس قاعدے کے مطابق، پٹنہ کی مسجد سے اسلام کے قابلِ نفرت اصولوں کی اشاعت کرتا رہا۔ جہاد کی تبلیغ اور روپیوں کی فراہمی کے لئے اس نے ماتحت ایجنٹ مقرر کر رکھے تھے۔ اس نے اپنی سازشوں سے برطانی ہند کو ایک ایسی سرحدی جنگ میں دھکیل دیا جس میں سینکڑوں جانیں ضائع ہو گئیں۔ وہ مشہور عالم ہیں۔ ان کے متعلق لاعلمی کا عذر نہیں پیش کیا جا سکتا۔ انھوں نے جو کچھ کیا، سوچ سمجھ کر اور عزمِ راسخ کے ساتھ باغیانہ طریقے پر کیا۔ ان کا تعلق ایک موروثی باغی اور "جہادی" خاندان سے ہے۔"[۱]

---

[۱] انڈین مسلمانز۔ ص ۸۵

HE BELONGS TOA HEREDITARILY DIS DIS LOYAL

AND FANATICAL FAMILY

ہمارے خاص کرم فرما ڈاکٹر ولیم ولسن ہنٹر مولانا یحییٰ علی اور منشی محمد جعفر صاحب تھانیسری کی سزا یابی پر اس طرح اظہار ہمدردی فرماتے ہیں :-

"جعفر، عرضی نویس اور یحییٰ علی واعظ نے وفاداری کا کبھی دعویٰ نہیں کیا اور نہ ہم سے کوئی مراعات طلب کی۔ وہ بڑے مخلص اور بااصول آدمی تھے۔ انھوں نے اپنے آپ کو اس زہر آلود ہتھیار سے مجروح کیا، جسے ایک جھوٹے مذہب نے ان کے ہاتھ میں دے دیا تھا۔ انھوں نے اپنی غداری کی سزا بھگت لی۔ تاریخ ان کے اس انجام کو دردمندانہ جذبات کے ساتھ یاد کرے گی۔"[1]

ہنٹر نے محمد شفیع کے علاوہ تمام 'ماخوذین' کے کردار واخلاق کی تعریف کی ہے۔ لغزش اور معافی طلب کرنے کے باوجود محمد شفیع ہنٹر کے الزامات کا مستحق نہیں۔ اس مقدمہ سازش اور گرفتارانِ بلا کے متعلق ہنٹر کے خیالات کا مندرجہ ذیل بیان سے ہوگا :-

"اس بغاوت کے تین نمایاں پہلو، جو مقدمہ کے دوران میں ظاہر ہوئے، یہ ہیں :- (۱) حیرت انگیز قابلیت، جس سے دور دراز تک پھیلی ہوئی بغاوت کو منظم کیا گیا۔ (۲) رازداری، جس سے اس کی مختلف پیچیدہ کارروائیاں عمل میں لائی گئیں۔ (۳) خیر خواہی کا وہ زبردست جذبہ جس نے اس جماعت کے افراد کو ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ رکھا۔ ان کی کامیابی کا راز ان کے دلچسپ فرضی ناموں اور خفیہ زبان پر تھا۔ لیکن میں اس یقین کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ محمد شفیع، فوجی ٹھیکہ دار کے سوا یہ سب سازشی اپنا کام انتہائی خلوص اور فطرتی جوش کے ساتھ اللہ

---

[1] انڈین مسلمانز۔ ص ۸۸ - ۸۷

کی طرف سے عائد کردہ فرض سمجھ کر کرتے اور اس عزم کے ساتھ کہ مرتے دم تک اس فرض کو انجام دئے جائیں گے۔"[1]

دوسرا مقدمہ سازش:۔ پٹنہ ۱۸۶۵ء

انبالہ کے مقدمہ کے بعد حکومت اور اس کے ہوا خواہوں کو اس جماعت، سے اور کد ہو گئی۔ اور یاروں نے باقی ماندہ ممتاز اشخاص سے انتقام لینے کی فکر شروع کر دی۔ ان انتقامی کارروائیوں کا پہلا شکار سید صاحبؒ کے خلیفہ مولانا احمد اللہ صادق پوری (مولود ۱۲۲۳ھ) کو بنایا گیا۔ مولانا احمد اللہ خلف مولوی الٰہی بخش صاحب جعفری (ف ۱۲۷۵ھ) اپنے بھائیوں میں سب سے بڑے ہوئے تھے۔ اس لئے عظیم آباد کے ممتاز رئیسوں میں ان کا شمار تھا اور سرکاری حلقوں میں عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ ان کی عزت و وقعت کا یہ عالم تھا کہ جب ۱۸۵۷ء میں مسٹر ولیم ٹیلر، کمشنر پٹنہ نے احتیاطی تدبیر کے طور پر انہیں بے قصور گرفتار کر کے حراست میں رکھا[2]، تو وہ معطل[3] کر دیا گیا۔ لیکن یہ ٹیلر پٹنہ ہی میں وکالت کرتے لگا اور موقع کی تاک میں لگا رہا۔ جب انبالہ کا مقدمہ شروع ہوا تو پھر "حریفوں[4]" کی بن آئی اور ٹیلر نے آسمان زمین ایک کر دیا۔ اور حکومت نے مولانا احمد اللہ کو گرفتار کر کے ان پر الگ مقدمہ چلایا (۱۸۶۵ء)

---

[1] انڈین مسلمانز: ص۔۹۰ [2] W. TAYLOR کی کتاب THIRTY EIGHT YEARS INDIA جلد ۲، ص ۴۴۲، ۴۴۳ - [3] مولانا احمد اللہؒ کے ساتھ ان کے ماموں شاہ محمد حسین صاحبؒ (ف ۱۲۷۶ھ) خلیفہ حضرت سید صاحبؒ اور مولوی واعظ الحق صاحب ساکن گورہٹہ، پٹنہ، بھی ۱۸۵۷ء میں نظر بند کر دیئے گئے تھے۔ یہ لوگ تین مہینے نظر بندی کی حالت میں رہے پھر یہ لوگ رہا ہوئے اور ٹیلر معتوب ہو کر معزول کیا گیا (تذکرہ صادقہ۔ص ۷۴) [4] مسٹر ولیم ٹیلر کی معزولی کے سلسلے میں مسٹر SAMVELS ریونیو کمشنر پٹنہ ڈویژن اور گورنمنٹ بنگال کے درمیان جو مراسلت ہوئی تھی، اس کی ایک مطبوعہ کاپی (مطبوعہ کلکتہ ۱۸۵۸ء) راقم کی نظر سے گذری ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ٹیلر نے بعض مقامی مسلمان رئیسوں (جن کی اولاد اس وقت پٹنہ اور اس کے نواح میں موجود ہے) کی چغل خوری پر مولانا احمد اللہ کو گرفتار کیا تھا۔ ("مراسلات مذکورہ" ص ۱۹-۱۸)

یہ مقدمہ پہلے مسٹر منرو MUNRO آفیشیٹنگ مجسٹریٹ کے اجلاس میں پیش ہوا۔ پھر مسٹر اینسلی AINSLIE سیشن جج کے اجلاس میں سماعت ہوئی۔ دونوں اجلاسوں میں سزائے موت کا حکم ہوا۔ پھر کلکتہ ہائی کورٹ میں اپیل ہوئی تو سزائے موت حبس دوام سے بدل گئی۔ انڈمان بھیجے گئے۔ اور وہاں بھی سرکار کی خاص نوازش قائم رہی۔ اسی غربت اور جلاوطنی کے عالم میں تقریباً سولہ برس زندگی گذار کر ۶۷ سال کی عمر میں جان جان آفریں کے سپرد کی (ذی الحجہ ۱۲۹۸ھ)

یہ دوسرا مقدمہ سازش بعض حیثیتوں سے خاص اہمیت رکھتا ہے۔

(الف) انبالہ والے مقدمے کے "ماخوذین" کا جرم واضح اور ثابت تھا۔ مگر مولانا احمد اللہ کے خلاف کوئی معقول وجہ موجود نہیں تھی۔ ۱۲۸۰ھ، ۱۸۶۴ء تک تو وہ ان معاملات سے گویا الگ تھے ہی۔ آخری سال بھر کے واقعات سے متعلق بھی کوئی قابلِ وثوق شہادت موجود نہیں تھی۔ ان کے "مقدمے" کی ساری کارروائی اور فیصلے راقم کی نظر سے گذرے ہیں، پورا مقدمہ بنایا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ خود حکام کو اس بات کا اقرار ہے کہ الٰہی بخش (ملزم انبالہ ۱۱) کی شہادت کے بغیر مولانا احمد اللہ کی سزایابی مشکل تھی[1] اور الٰہی بخش ۱۸۶۴ء میں گرفتار ہو چکا تھا اور اس کی "مشروط معافی" مولانا کی سزایابی کے بعد ہوئی ہے۔

(۲) دوسری اہم بات یہ ہے کہ اس مقدمے کے مجسٹریٹ مسٹر راونشا T. E. REVENSHAW پہلے شخص ہیں جنھوں نے باضابطہ مجاہدین کے اعمال، اور سرگرمیوں کا جائزہ لیا اور سرکاری نقطۂ نگاہ سے ایک نہایت "قیمتی یادداشت"[2] MEMORANDUM حکومت کو بھیجی، جس میں بنگال اور بہار کے تمام مبلغوں اور کارکنوں کی ضلع وار فہرست دی گئی ہے، اور اسی فہرست کے بموجب تقریباً دس سال تک یہ غریب تنگ کئے جاتے رہے۔ اور اسی کی وجہ سے بنگال

---

[1] مراسلہ مسٹر G. F. COCKBURN کمشنر پٹنہ ڈویژن بنام سکریٹری گورنمنٹ بنگال۔ مورخہ ۱۳ مئی ۱۸۶۵ء۔

[2] ضمیمہ، کلکتہ گزٹ: ۲۰ ستمبر ۱۸۶۵ء۔

کے کتنے خوشحال خاندان تباہ و برباد کر دیے جاتے رہے۔ مشہور بنگالی قانون داں سر عبدا (موجودہ اسپیکر مرکزی اسمبلی) نے ایک موقع پر یہ حقیقت ان لفظوں میں ظاہر کی تھی:۔

"۱۸۷۰ء میں حکومت نے وہابی تحریک کے سبب سے جو محض وہم و گمان پر مبنی تھی، بنگال کے مسلمان جاگیرداروں اور زمینداروں کی تمام املاک جو رقبہ میں پورے صوبہ بنگال کی چوتھائی تھی، ضبط کرلی۔ جس سے ہزاروں مسلمان خانماں برباد اور پریشان ہو گئے۔"

(خطبۂ صدارت مسلم لیگ ۱۹۲۵ء)

ممکن ہے یہ بیان کچھ مبالغہ آمیز ہو، پھر بھی صورتِ حال کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ ہنٹر اور راوکنلے اور دوسرے انگریز لکھنے والوں کا ماخذ راونشا کی یہی یادداشت ہے۔

۳۔ اسی راونشا نے اپنی یادداشت میں پہلے پہل علماء صادق پور کی غیر منقولہ جائدادوں[1] کی ضبطی، مکانات[2] کے انہدام۔ اور سرحد پار[3] مقیم افراد نیز دوسرے[4] کارکنوں کے خلاف سخت کارروائی کی سفارش کی۔

"پٹنہ کے مسلمان اس بات پر متفق ہیں کہ ملزمین کی جائداد (منقولہ) پر نیلام نہ بولیں۔ اور بعض منقولہ چیزیں بہت مشکل کے بعد معمولی قیمتوں پر فروخت کردی گئیں۔"

"صادق پور کا احاطہ پٹنہ میونسپلٹی کو دے دیا جائے اور مکانات زمین کے برابر کر دیے جائیں اور وہاں ایک بازار بنایا جائے ... میرے خیال میں اس سے زیادہ اچھا مصرف اس زمین کا نہیں ہوسکتا۔

جائداد غیر منقولہ تو سب ضبط ہو ہی گئی جس کی ایک مکمل فہرست راقم نے حاصل کرلی ہے۔ کانگریس وزارت (۳۷ء ۔ ۳۹ء) کے زمانے میں ایک ممبر کے ذریعہ مجلسِ قانون ساز (بہار) میں صادق پور کی ضبط شدہ جائدادوں کے متعلق سوال کرایا گیا۔ جس کے جواب میں حکومت نے بڑی تلاش و جستجو کے بعد ضبط شدہ جائداد کی پوری فہرست فراہم کردی تھی۔

راونشا کی سفارش کے بموجب مکانات بھی زمین کے برابر کردیے گئے تھے، اور اب
ان پر پٹنہ سٹی میونسپلٹی کی عمارت قائم ہے ۱۹۳۴ء کے زلزلے میں اس کی دوبارہ مرمت
ہوئی۔ مگر تاریخ قائم شدہ ۱۸۶۵ء؛ ESTABLISHED 1865 اس پر درج ہے۔ میونسپلٹی
کے باہر چھوٹا سا بازار بھی ہے۔ جائداد غیر منقولہ کی ضبطی کے سلسلے میں سب سے زیادہ افسوسناک
بات یہ ہے کہ مولانا احمد اللہؒ کا قیمتی کتاب خانہ بھی ضائع کردیا گیا۔ مولاناؒ کے بڑے بیٹے حکیم
عبدالحمید عظیم آبادی (جو اُس وقت نوجوان طبیب تھے اور بعد میں ادیب و طبیب کی حیثیت
سے ہمہ گیر شہرت حاصل کی، اور "استاذالاساتذہ" کے درجے پر فائز ہوئے۔ استاذ محترم
مولانا سید سلیمان ندوی مدظلہٗ انہیں "خاقانی ہند" کے لقب سے یاد کرتے ہیں) کا
مختصر سا دواخانہ بھی ضبط کر لیا گیا۔ مثنوی شہر آشوب میں لکھتے ہیں:۔

نام نان و نشان قوت میرس	صورت قوت لایموت میرس
حال قوت و نشان و منزل من	عالم الغیب داند و دل من
یک دواخانہ وجہ قوتم بود	مایۂ قوت لا یموتم بود
آمد آں خانہ ہم بمعرض ضبط	شد ہمہ نظم روزیم بے ربط الخ

اس "چنگیزی" حکم کے بعد کیا ہوا؟ اس کے بیان کے لئے ایک دفتر چاہیئے۔ مختصر یوں
سمجھئے کہ خاندان صادق پور کی تمام عورتیں اور بچے حکیم ارادت حسین صاحب (ف مکہ معظمہ
۱۲۹۴ھ) کے مکان میں پناہ گزیں ہوئے۔ حکیم صاحبؒ بھی خاندان صادق پور سے قریبی
تعلق رکھتے تھے۔ مگر وہ مقدمہ انبالہ کے بعد ہی مکہ معظمہ ہجرت کر گئے تھے (رجب ۱۲۸۱ھ،

---

[1] تمام متاخرین علمائے صادق پور انہیں کے شاگرد ہیں۔ جس طرح اکثر متقدمین حضرات صادق پور ان کے
والد ماجد مولانا احمد اللہؒ (ف ۱۲۹۸ھ) کے شاگرد تھے۔ خاقانی ہند حکیم عبدالحمیدؒ صاحب عظیم آبادی (ف ۱۳۲۳ھ)
سے راقم کو بھی نسبت کا شرف حاصل ہے۔ استاذی و والدی مولانا حکیم محمد عبدالشکور صاحب مدظلہ (مولود ۱۲۹۰ھ)
ان سے طب کی تحصیل کی تھی۔

بلبل ہمیں کہ قافیہ گل شود بس است

نومبر ۱۸۶۴ء) اور وہیں تیرہ برس زندگی گذار کر مالکِ حقیقی کی بارگاہ میں حاضر ہو گئے۔ اس لئے ان کا مکان اغیار کی دست برد سے بچ گیا۔ اور پورے صادق پور میں ہی ایک مکان ہے، جو اپنے حال پر اب تک باقی ہے[1]۔ مردوں میں صرف حکیم عبد الحمید صاحب دیکھ بھال کے لئے تھے، مولوی محمد حسین صاحبؒ بن مولانا ولایت علی صاحبؒ اولاً تو بہت کم سن تھے۔ دوسرے وہ کلکتہ سے لے کر انبالہ تک مقدموں کی پیروی میں سرگرداں تھے۔ حکیم صاحب نے اپنی مثنوی میں اس بے کسی اور خانہ ویرانی کا دردناک منظر کھینچا ہے:۔

کنم الحال مختصر مرقوم	ماجرائے عیالِ آں[2] مظلوم
چوں شب عید را سحر کردند	ہمہ را از مکاں بدر کردند
ضبط و تاراج جملہ مال و متاع	نقد و جنس و ہمہ اثاث و ضیاع
بہر ما بود آہ جرمے سخت	بردنِ سوزنے ز جملہ رخت
احدے را نہ بد چہ مرد و چہ زن	حکم ہمراہ بردن سوزن
ہمہ سرگشتہ بے سر و ساماں	نہ غم جیب و نہ غم داماں
من نہ تنہا کہ ہمرہم تنہا	بچگان و زنان و شیوہا
مایۂ عیش ساز ماتم شد	عید ما غرۂ محرم شد

یہ "خانہ ویرانی" ٹھیک عید کی صبح کو شروع ہوئی (۱۲۸۲ھ، ۱۸۶۵ء) آزمائش پر آزمائش، کریلا اور نیم چڑھا، کہنا شاید صحیح ہو۔

"کتاب[3] خانہ" کی بربادی پر حکیم صاحبؒ کے تاثرات بھی قابلِ "عرض" ہیں:۔

---

[1] حکیم ارادت حسین صاحب (ف ۱۲۹۴ھ) کا پرانا گھر اب تک آباد ہے۔ ان کے پوتے خاندان کی روایات کے محافظ اور عالم باعمل ہیں۔ مولانا عبد الغفار صاحب ان میں خاص طور پر ممتاز ہیں۔

[2] حکیم عبد الحمید صاحبؒ کا اشارہ اپنے والد مولانا احمد اللہؒ کی طرف ہے۔

[3] صادق پور کی کتابیں آج بھی پٹنہ کی مختلف لائبریریوں میں نظر آجاتی ہیں۔ خدا بخش اورنٹیل لائبریری میں راقم کی نظر سے علمائے صادق پور کی مہر کردہ بعض کتابیں نظر سے گزری تھیں۔ ابھی ابھی پچھلے دنوں ایک عزیز کے ہاتھ

کتبِ ملتِ مسلماناں — رفت دردست حرف ناخواناں
داند او ہر کہ باتمیز بود — مال یغما کرا عزیز بود
راست گویند ایں مثل گفت است — دل بے رحم و دولت مفت است

ان بیچاروں کی قلبی حالت کیا تھی ؟ اس کا اندازہ لگانے کے لئے مثنوی کے یہ تین شعر کافی ہیں :—

صرصر فتنہ چوں وزیدے تند — حسبِ حال ایں دو بیت دل می خواند
دلِ ظالم بقصدِ کشتنِ ماست — دلِ مظلوم ما بسوئے خدا است
او دریں فکر تا بما چہ کند — ما دریں فکر تا خدا چہ کند

راونشا نے تو صرف مکانات کے انہدام کا مشورہ دیا تھا۔ مگر "ذمہ دارانِ امن و امان" نے قبریں بھی کھود ڈالیں۔ مولانا عبدالرحیم صادق پوری (ف ۱۳۴۱ھ) جب بیس سال کے بعد انڈمان سے واپس ہوئے (سن ۱۳۰۰ھ) تو خاندانی قبرستان کا یہ دلدوز منظر دیکھ کر دل بھر آیا۔ اور "کراماً کاتبین" کی انتہائی سختی کے باوجود ان کی آنکھوں سے خون کے قطرے ٹپک پڑے۔

"۔ ۔ ۔ ۔ بہرکیف میں سپرنٹنڈنٹ صاحب کے بنگلے سے رخصت ہو کر محلہ نمونیہ[1] میں پہنچا۔ جہاں کہ میرے اہل و عیال مقیم تھے۔ اس کی صبح ہو کے صادق پور گیا تو وہاں دیکھا کہ ہم لوگوں کے مکانات کل منہدم کر کے کفِ دست میدان بنا دیا گیا ہے۔ اور اس پر بازار اور میونسپلٹی کے مکانات بنا دئے گئے ہیں۔ میں نے چاہا کہ اپنے خاندانی مقبرہ کو کہ

میں پٹنہ کالج لائبریری سے مستعار لی ہوئی ایک کتاب دیکھی، جس پر جابجا (فرحت حسین ۱۲۵۶ھ) کی مہر لگی ہوئی ہے۔ دیکھنے پر یہ کتاب، نہیں، بلکہ چند کتابوں کا مجموعہ ثابت ہوا۔ اور کتابیں بھی سب کی سب توحید و دعوت جہاد سے متعلق اس سے زیادہ عبرت انگیز بات یہ ہے کہ یہ مجموعہ پٹنہ کے ایک رئیس (جو چغل خوری میں شریک تھے) نے پٹنہ کالج لائبریری کو ہدیہ کیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "لوٹ" کے مال کا کچھ ان "مابین" کے لوگوں کو بھی مل گیا تھا۔

[1] صادق پور اور موجودہ بانکی پور کے درمیان شہر پٹنہ کا ایک محلہ۔

جہاں چودہ پشت سے ہمارے آبا و اجداد دفن ہوتے چلے آئے تھے، جاکر دیکھوں۔ اور خصوصاً اپنے والدین ماجدین غفر اللہ لہما کے مزار کی زیارت کروں اور اس پر دعائے مغفرت اور فاتحہ پڑھوں۔ مگر ہر چند کوشش کی، پتہ نہ ملا۔ بعد تجسس و تفحصِ بسیار و غور و فکر کر کے قرینہ سے معلوم ہوا کہ حضرت والدین ماجدین کی قبریں کھود کر اس پر بنائے عمارت میونسپلٹی بنادی گئی ہے :۔

یا منزلاً لعب الزمان باھلہ   فاباد ھم بتفرق لا یجمع

(اے وہ منزل، جس کے رہنے والے زمانے کے دست برد کے شکار ہوئے اور انہیں زمانے نے ایسا منتشر کیا کہ پھر جمع ہونے کی توقع نہیں)

ان الذین عھدتھم بک مرۃ   کان الزمان بھم یضر و ینفعُ

(وہ جنہیں میں نے کبھی تیری آغوش میں آسودہ حال دیکھا تھا، زمانہ ان کے سہارے نفع و نقصان پہنچاتا تھا)

اصبحت تفزع من یَراکَ وطالما   کُنّا الیک من المھاول نفزع

(جو تجھے اب دیکھتا ہے، گھبرا اٹھتا ہے۔ اور کبھی مشکلات سے گھبرا کر ہم تیری آغوش میں پناہ ڈھونڈھتے تھے)

ذھب الذین یعاش فی اکنافھم   لقی الذین حیاتھم لا تنفع

(وہ لوگ تو گذر گئے، جن کے سائے میں زندگی، زندگی تھی۔ اب وہ لوگ رہ گئے ہیں، جن کی زندگیاں کسی کام کی نہیں)[1]

"اے حضرات ناظرین۔ اس وقت اس حرکت کا جو ہمارے اموات کے ساتھ کی گئی، جو صدمہ دل پر گذرا، وہ بیرونِ از حیطۂ تقریر و تحریر ہے۔ اس وقت تک اس کی یاد سے بدن کے رونگٹے تک کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یہ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ ہمارے حرم میں ہمارے اموات و آبا و اجداد کی قبریں کیونکر کھودی گئیں اور وہ مقبرہ کیوں معرضِ ضبطی میں آیا؟

---

[1] ان شعروں کو ترجمہ قصداً لفظی نہیں کیا گیا۔

ہماری "عادل گورنمنٹ" نے کیوں یہ کام کیا؟ (تذکرہ صادقہ: ص ۱۷۹)

۴۔ صادق پور کے مکانات کے انہدام کے علاوہ راونشا صاحب کی ایک سفارش یہ تھی:

"مقیم سرحد مولویوں کے خلاف سخت کارروائی کی جائے۔ ان کی جائدادیں ضبط کرلی جائیں اور ان کے مقامی کارکنوں پر کڑی نگاہ رکھی جائے خاص کر حاجی بدرالدین (ڈھاکہ) اور مولوی عبدالجبار (کلکتہ) پر مقدمہ چلانا ضروری ہے۔" (یادداشت ۳۲/۳۰-)

راونشا کی یہ سفارشیں مقبول ہوئیں۔ اور پورے بہار اور بنگال میں داروگیر کا بازار سالہا سال تک گرم رہا۔ ان سفارشوں کی قبولیت کی اطلاع سکریٹری بنگال گورنمنٹ نے کمشنر پٹنہ ڈویژن کو ان لفظوں میں دی۔[1]

(i) ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

(ii) حکومتِ پنجاب سے الٰہی بخش کی معافی کی کوشش کی جائے گی نیز اس کے مکان اور پانچ سو روپے کی واپسی کی۔

(iii) ــــــ (iv) ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

(v) یہ تجویز کہ صادق پور کا احاطہ پٹنہ میونسپلٹی کو دے دیا جائے تاکہ اسے زمین کے برابر کردیا جائے اور اس جگہ ایک کھلا بازار بنایا جائے۔ حکومتِ ہند میں پیش کی جائے گی۔ لفٹننٹ گورنر کی رائے ہے کہ جائداد غیر منقولہ کی آمدنی کا بھی ایک حصہ میونسپلٹی کو دیا جائے۔

(vi) لفٹننٹ گورنر ان اشخاص کے خلاف جن کا ذکر مسٹر راونشا کی رپورٹ کے دفعہ ۳۲/ میں آیا ہے۔ قانون ضابطہ فوجداری (دفعہ ۱۹۹-۱۸۳) کے ماتحت فوری کارروائی کی اجازت دیتے ہیں۔

اس دوسرے مقدمہ سازش کی مندرجہ بالا تفصیلات سے یہ بات واضح ہوگئی

---

[1] مراسلہ ۵۲۱/، مورخہ ۲۶ جولائی ۱۸۶۵ء

ہو گی کہ اس کا مقصد صرف خاندانِ صادق پور اور ان کے اعوان و انصار کو تباہ و برباد کرنا تھا۔ خاندان کا دنیوی جاہ و جلال تو اسی مقدمے کی نذر ہو گیا۔ رہ گئے اعوان و انصار ان میں جو سخت جان رہ گئے تھے، ان کے لئے تین مقدمے اور چلائے گئے (مالدہ ۳ ستمبر ۱۸۷۰ء، راج محل اکتوبر ۱۸۷۰ء، پٹنہ ۵ مئی ۱۸۷۱ء) ان مقدمات، میں کیا کیا ہوا اور ناکردہ گناہوں کو سزا دینے کے لئے کیا کیا جتن کئے گئے اس کے متعلق ایک واقف کار اور مبتلائے الم کے تاثرات ملاحظہ ہوں :۔

"جو آگ گرفتاری وہابیان ۱۸۶۳ء میں تھانیسر میں روشن ہوئی تھی، اس کو روز بروز ترقی ہوتی گئی۔ . . . آخر کو ڈاکٹر ہنٹر صاحب نے تو ہزاروں من ولایتی بارود اور کراشن آئل اس میں ڈال دیا۔ اور ہماری سرکار کو یہاں تک بھڑکایا کہ صادق پور، پٹنہ کے وہ مکانات کہ جن میں قافلہ کے لوگ ٹھیرا کرتے تھے، مع مکانات سکنی ان فرضی باغیوں کے کھدوا کر پھنکوا دیئے مگر اس پر بھی سرکار کا دل ٹھنڈا نہ ہوا۔ ۱۸۷۲ء کے آخر تک پٹنہ اور بنگال میں سلسلہ گرفتاری بے گناہوں کو جاری رکھا۔ بیچارہ امیر خاں سوداگر چرم اور مولوی تبارک علی وغیرہ بہت سے آدمی پٹنہ میں پکڑ لئے مولوی امیر الدین صاحب کو بینہ میں جا پکڑا۔ ایک بوڑھے اور ضعیف شخص ابراہیم منڈل کو اسلام پور میں ـــــ اور اپنے معمولی اور پرانے گواہوں سے جو چاہا، گواہی دلوا کر بیچاروں کو کالے پانی کو روانہ کیا اور امیر خاں کی چند کروڑ کی جائداد سے اپنا کل خرچہ پورا کر لیا۔"[1] . .

"اور پھر ۱۸۷۱ء تک جو جو مقدمات گرفتاری وہابیان مثل مقدمہ امیر خاں صاحب سوداگر چرم و مولوی تبارک علی صاحب و مولوی امیر الدین ساکن بینہ و ابراہیم منڈل ساکن اسلام پور ہوتے رہے، تو بھی معمولی گواہ یا

---

[1] تواریخ عجیب : ص ۷۷-۷۶

گو بندہ سرکار جھوٹی گواہی دینے کو بلائے جاتے تھے۔ اور میں نے خود ان میں سے ایک گواہ کی زبانی سنا ہے کہ جب کبھی خلاف گواہی دینے سے ہم نے انکار بھی کیا تو ہم کو یہ کہا گیا کہ تم لوگ شرطیہ طور پر فقط اسی گواہی دینے کے واسطے بطور رگو بندہ رہا کیے گئے ہو۔ اگر گواہی نہ دوگے تو پھر تم کو دائم الحبس کر کے پہلے ہی وارنٹ پر کالے پانی کو بھیج دیا جائے گا۔" (تاریخ عجیب۔ ص ۹۴)

تیسرا مقدمہ سازش : مالدہ ۱۸۷۰ء

مالدہ اور راج محل کے مقدموں کی تفصیلی روداد نہیں مل سکی۔ پھر بھی انبالہ اور پٹنہ کے دونوں مقدموں (۱۸۶۵ء اور ۱۸۷۱ء) کی رپورٹوں اور سرکاری کرم فرماؤں کی تحریروں سے جو کچھ معلوم ہو سکا ہے، وہ درج ذیل ہے:۔

"مقدمہ انبالہ کے بعد وہابی اپنا پروپیگنڈا کرتے رہے تا آنکہ حکومت تشدد پر مجبور ہو گئی اور مختلف مقدمات چلائے گئے۔ ۱۸۶۵ء کا مقدمہ سازش، پٹنہ بھی اسی سلسلے میں چلایا گیا تھا۔ پھر کچھ سراغ ملا تو ۱۸۷۰ء میں مالدہ اور راج محل کے مقدمے دائر ہوئے۔"[۱]

۱۸۷۰ء کے دو مقدموں میں، پہلا مالدہ میں مولوی امیر الدین پر چلایا گیا۔ مولوی امیر الدین کون تھے؟ ایک صاحب لکھتے ہیں:۔

"مولانا ولایت علی کے خلیفہ عبد الرحمٰن لکھنوی نے مالدہ میں تبلیغ کی اور وہیں بس گئے۔ ان کے کارکنوں میں ایک صاحب رفیق منڈل نامی تھے، وہ ۱۸۵۳ء میں گرفتار ہوئے، پھر رہا کر دیے گئے۔

اس کے بعد انھوں نے اپنے بیٹے امیر الدین کے ذمہ یہ خدمت کی۔ ۱۸۶۵ء کے مقدمے کے دوران امیر الدین کی شرکت کا راز کھلا۔ لیکن وہ اپنا کام کرتا رہا۔ ان کے حلقے میں پورا مالدہ ضلع اور راج شاہی اور مرشد آباد

---

[۱] ہنٹر: ص ۹۷

کے کچھ حصّے تھے۔[۱]"

"ایک شخص عبدالرحمٰن نامی (خلیفہ مولانا ولایت علیؒ) مالدہ، تبلیغ کرتے ہوئے آئے۔ پھر وہ وہاں رہ پڑے۔ شادی کرلی اور ایک اسکول میں معلم ہوگئے۔ ان کی تبلیغ کامیاب ہوئی، آدمی اور رقم سرحد کو بھیجتے رہے۔ سالہاسال تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ ۱۸۵۳ء میں ان پر شبہ ہوا، گرفتار ہوئے، پھر چھوڑ دیئے گئے۔"

"اس کے بعد ان کا کام[۲] ان کے بیٹے مولوی امیرالدین نے سنبھالا۔ جنھوں نے اپنے فرائض نہایت خوبی سے انجام دئے۔ مقدمہ پٹنہ ۱۸۶۵ء میں ان پر شبہ ہوا۔ تنبیہ کی گئی، لیکن یہ اپنا کام زور و شور سے کرتے رہے اور مقدمہ مالدہ کے افسر انچارج کے غیر جانبدارانہ بلکہ ایک حد تک قدردانی کے الفاظ میں "اس نے اس وقت سے لے کر گرفتاری تک نہایت ایمانداری سے جہاد کو جاری رکھنے کے لئے بھرتی کرنے کی کوشش کی۔[۳]"

راونشا کی یادداشت میں مالدہ کے کارکنوں کے بارے میں حسبِ ذیل بیان ملتا ہے:۔

"راج شاہی کی طرح اس ضلع میں بھی جماعت بہت نمایاں ہے۔ . . .

---

[۱] جنرل رایل ایشیاٹک سوسائٹی، بمبئی: جلد ۱۴، ص ۳۷۰

[۲] ہنٹر نے مولوی امیرالدین کو مولوی عبدالرحمٰن کا بیٹا لکھا ہے حالانکہ اس کے "پیش رو" اور "گرو" راونشا نے (ولد رفیق منڈل) کی تصریح کی ہے ــــــــ نیز رفیق منڈل کے حالات میں راونشا لکھتا ہے:۔

"اس کا بیٹا شکور محمد آج کل ستھانہ میں رہتا ہے۔ اور دوسرا لڑکا، جس کا نام نہیں معلوم، آج کل مضافات میں تبلیغ و تحصیل کا کام کرتا ہے۔"

[۳] ہنٹر: ص ۷۲

اسی زمانے میں شفیع اللہ منڈل نے . . . . . روپے جمع کیے جو ایک مولوی کو دیے، جو چند مریدوں کے ساتھ گاؤں میں تبلیغ کے لئے آیا تھا۔ اس مولوی کا نام امیر الدین (ولد رفیق منڈل) ہے۔ کچھ دن ہوئے، یہ بغاوت پھیلانے کے جرم میں گرفتار بھی ہوا تھا۔ اور مرشد آباد جیل میں محبوس رہا تھا۔"

ان میں مولوی امیر الدین صاحب پر مالدہ میں "بغاوت" کا مقدمہ دائر کیا گیا۔ ہائی کورٹ سے حبس دوام بعبور دریائے شور اور املاک کی ضبطی کی سزا ہوئی۔ مارچ ۱۸۷۲ء میں انڈمان پہنچے۔

مولوی محمد جعفر صاحب کے بیان کے مطابق انہیں انڈمان میں ایک مدت تک سخت مشقت برداشت کرنا پڑی۔ بعد میں ایک مدرسے کے معلم بنا دیے گئے تھے۔ ۱۸۸۳ء میں عام رہائی کے حکم سے انہیں بھی فائدہ اٹھانے کا موقع مل گیا۔ اور صرف دس گیارہ سال جلاوطنی میں بسر کرنے کے بعد وطن واپس ہو گئے۔[۱]

چوتھا مقدمہ سازش۔ راج محل اکتوبر ۱۸۷۰ء

راج محل صوبہ بہار بھاگلپور کمشنری کے اندر واقع ہے۔[۲]

یہ ایک پہاڑی علاقہ ہے۔ مالدہ ضلع، گو بنگال میں ہے، لیکن دریا کی راہ سے راج محل اور مالدہ بالکل ملے ہوئے ہیں۔ راج محل کے نواح میں ایک قصبہ اسلام پور ہے۔ وہیں ایک بزرگ ابراہیم منڈل تھے جنہیں مجاہدین کی تحریک سے خاص دلچسپی تھی۔ منڈل اس نواح میں 'چودھری'، یا 'پٹیل'، کو کہتے ہیں۔ راوننشا کے "اسماء الرجال" میں کئی بزرگ "منڈلی" کے نام سے موسوم نظر آتے ہیں۔ یہ لفظ منڈل ہے۔ یہ قصبہ اسلام پور آج بھی اس نواح میں اپنی دینداری اور اخلاقی برتری کے لحاظ سے ممتاز ہے۔ راقم نے اپنے ملنے والوں میں

---

[۱] تواریخ عجیب: ص ۷۷

[۲] راج محل پہلے مالدہ ضلع میں تھا۔ پھر مرشد آباد (بنگال) میں ضم کر دیا گیا۔ آج کل ستھانہ پرگنہ (بھاگلپور کمشنری۔ بہار) میں شامل ہے۔

پروفیسر عبد الباری[1] کو ان لوگوں کی دینداری کا بہت مداح پایا۔ اسی طرح میرے ایک دوسرے دوست منظور احسن صاحب (کمر ڈیہی۔ مان بھوم) جو اسی علاقے میں پتھروں کا کاروبار کرتے ہیں، خاص طور پر اسلام پور والوں کی مذہبیت کی تعریف کرتے تھے۔

خلاصہ یہ کہ مالدہ کے بعد فوراً ہی راج محل میں ابراہیم منڈل پر مقدمہ دائر کیا گیا (اکتوبر ۱۸۷۰ء) اور تمام ملزموں کی طرح انہیں بھی "شہادت" سے محروم رکھا گیا اور صرف "حبس دوام بعبور دریائے شور اور ضبطی جائداد" کی سزا ہوئی۔ ابراہیم منڈل کے متعلق ذاتی تحقیق سے صرف اتنا معلوم ہو سکا کہ وہ اصحاب صادق پور میں سے کسی کے مرید تھے اور راج محل کے علاقے میں ان کی دھاک تھی۔ اب بھی ان کے خاندان کے لوگ خوش حال ہیں، مگر وہ آگ ٹھنڈی ہو چکی ہے۔ ان کے وطن اسلام پور میں ایک مدرسہ بھی ہے۔ رسالہ اشاعت السنہ[2] سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ یہ امیر خاں کے ساتھ ۱۸۷۸ء میں لارڈ لٹن (۱۸۷۶ء۔ ۱۸۸۰ء) کے حکم سے رہا کر دیئے گئے تھے اور غالباً انڈمان بھی نہیں بھیجے گئے[3]۔ ہمارے مہربانِ خاص ہنٹر صاحب نے بھی مالدہ اور راج محل کے مقدموں کی طرف صرف سرسری طور پر اشارہ کیا ہے:۔

> "سنہ ۱۸۷۰ء میں ایسے (یعنی اضلاع کے) دو مرکز SEHLEMENTS توڑ دیئے گئے۔ ان کے سرکردہ مبلغوں کو غیر جانبدار عدالتوں سے عبور دریائے شور اور ضبطی املاک کی سزا ہوئی۔ ان کی سازش کا جال، برطانیہ کے علاوہ کسی کمزور حکومت کو بہ آسانی مرعوب کر سکتا تھا۔[4]"

"غیر جانبدار" عدالتوں کا تجربہ تو اس ملک کے ستم زدوں کو ہزار بار ہو چکا ہے۔ اس لئے

---

[1] بہار کے مشہور کانگریسی لیڈر جو اسی حلقے سے اسمبلی میں منتخب ہوا کرتے تھے۔

[2] مزید تحقیق سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ان کے انتقال کو چالیس بیتالیس برس ہوئے ہیں ان کے پوتے اس وقت زندہ ہیں اور ابھی ایسے لوگ زندہ ہیں، جنھوں نے ابراہیم منڈل کو دیکھا ہے۔

[3] جلد ۵، ص ۱۲   [4] ص ۷۰

اس پر کسی تبصرے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ البتہ اس سلسلے میں یہ بیان شاید دلچسپی سے سُنا جائے کہ مجاہدین کے ایک بڑے کرم فرما اور ان سب میں جماعت سے زیادہ واقف مسٹر جیمس اوکنلے JAMESOKINESLY ان مقدموں میں خاص طور پر سرکاری طرف سے پیروکار مقرر کیے گئے تھے اور انہوں نے یہیں راج محل میں بیٹھ کر مولانا کرامت علی جون پوری (ف ۱۲۹۰ھ، ۱۸۷۳ء، جن کے بارے میں یہ لکھ آئے ہیں کہ ان کی روش، سید صاحب کے اصحاب خاص کے مسلک سے الگ ہو گئی تھی) کو یہ سند، عطا کی ہے[1]۔ جسے ان کے عزیزوں اور معتقدوں نے ۱۹۱۴ء میں نہایت دیدہ زیب طریقے پر طبع کرایا تھا تاکہ وقت پر کام آئے:

مولانا کرامت علی جون پوری کی تمام تصنیفات پڑھنے کی میں نے مسرت حاصل کی ہے اور میں اپنے علم کی بنا پر شہادت دے سکتا ہوں کہ انھوں نے اپنے کو ہمیشہ ایک راسخ العقیدہ ORTHODOX حنفی عالم، وہابیوں کے کٹر دشمن PERSISTENT OPPONENT اور ہندوستان میں برطانوی حکومت کے ہواخواہ کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔

پانچواں مقدمہ سازش۔ پٹنہ ۱۸۷۱ء

یہ آخری مقدمہ سازش، پٹنہ میں دائر ہوا اور بعض حیثیتوں سے زیادہ اہم ہے۔ پہلی مارچ ۱۸۷۱ء میں مسٹر باربر D.M. BARBOUR آفیشٹنگ جائنٹ مجسٹریٹ، پٹنہ کے اجلاس میں اس کی سماعت ہوئی مجسٹریٹ نے ۲۷ مارچ کو ملزموں پر فرد جرم عائد کر کے سیشن سپرد کیا اور پہلی مئی کو مقدمہ کھلنے پر کل ۱۳۶ سرکاری گواہوں اور کچھ ملزموں کے گواہوں کو حاضری کا حکم دیا گیا۔

یہ گواہ شمالی ہندوستان کے تقریباً ہر حصے کے تھے۔ پشاور، ہزارہ اور ماورائے

---

[1] مورخہ ۳۱ اکتوبر ۱۸۷۰ء، یعنی مقدمہ کی پیروی کے دوران یا دو چار دن بعد۔

[2] ہنٹر نے بھی مولوی کرامت علی صاحب کے ایک وفادارانہ فتوی کا ذکر کیا ہے (ص: ۱۰۸)

سرحد سے لے کر مدنا پور اور باقر گنج جیسے مشرقی اضلاع (بنگال) سے یہ گواہ لائے گئے تھے۔ بعض عذروں کی بناء پر کلکتہ ہائی کورٹ کو انتقالِ مقدمہ کی درخواست کی گئی اور اس لئے ۱۳ مئی تک سماعت ملتوی رہی۔ ہائی کورٹ نے انتقال مقدمہ کی درخواست نامنظور کی تو التوا کی درخواست دی گئی۔ جس پر ہائی کورٹ نے ۲۹ مئی تک سماعت التوا کا حکم دیا۔ یہ حکم بالکل غیر عادی تھا۔ اس لئے کہ اس عدالت میں کوئی ایسی درخواست نہیں دی گئی جس پر اُسے تعزیراتِ ہند کے دفعہ (۳۶۱) کے مطابق غور کرنے کا موقع ملتا۔

اس کے بعد جج صاحب نے ہائی کورٹ کی زیادتیوں کا شکوہ کیا ہے۔ خلاصہ یہ کہ مقدمہ ۳۰ مئی کو شروع ہوا، اور کچھ وقفوں کے ساتھ ۱۹ جولائی تک جاری رہا۔ کل ۳۸ روز مقدمے کی سماعت ہوئی جس میں سب ملاکر ۱۵۹ گواہ پیش ہوئے (۱۱۳ سرکار کی طرف سے اور ۴۶ ملزموں کی جانب سے) ان کے علاوہ خطوط اور کاغذات کے انبار نے بھی اچھا خاصا وقت لیا۔[1]

اس مقدمے میں کل سات ملزم تھے :۔ پیر محمد[1]، امیر خاں[2]، حشمداد خاں[3]، مبارک علی[4]، تبارک علی[5]، حاجی دین محمد[6]، امین الدین[7]۔

ملزموں میں جماعتی حیثیت سے سب سے زیادہ اہم مولوی مبارک علی صاحب تھے۔ ان کا ذکر تنظیم جماعت کے سلسلے میں آچکا ہے۔ مولانا احمد اللہ رح (ف ۱۲۹۸ھ) کی گرفتاری (۱۲۸۱ھ، ۱۸۶۵ء) کے بعد یہ جماعت کے نظم و نسق کے ذمہ دار ہوئے۔ انبالہ کا سفر بھی کیا۔ آخر ۱۲۸۴ھ، ۱۸۶۸ء) میں گرفتار ہوئے۔ پھر ۱۸۷۱ء کے آخری مقدمہ سازش میں دھر گھسیٹے گئے اور سخت اذیت دی گئی۔ تاآنکہ اسی حال میں روح نے جسم خاکی سے رہائی حاصل کی (ف تقریباً ۱۲۸۸ھ)

ان کے صاحبزادے مولوی تبارک علی بھی اس مقدمے میں ماخوذ تھے "جرم" کی نوعیت کے لحاظ سے ان کا نام سب سے پہلے آنا چاہیئے۔ ان پر الزام یہ تھا کہ مولوی عبداللہ (ف ۱۳۲۰ھ) کے ساتھ امبیلا کی مہم (۱۸۶۳ء) میں یہ شریک تھے اور ایک دستے کی کمان

---

[1] وہابی ٹرائل : ص ۱۵۱

ن کے ہاتھ میں تھی۔ حاجی دین محمد اور امین الدین پر باغیوں کی اعانت کا الزام تھا۔
شمداد خاں کو سشن جج نے رہا کر دیا کہ ان کے خلاف بادی النظر میں مقدمہ[۱]
PRIMA FACIA CAS ثابت نہ ہو سکا۔ پیر محمد ہائی کورٹ سے بری ہوئے۔ لیکن ان
سب میں عجیب و غریب معاملہ امیر خاں کا ہے اور اس آخری مقدمے کی ساری اہمیت
ان ہی کی وجہ سے ہے۔

ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ ان میں سے اکثر "ملزم" مختلف وقتوں میں گرفتار کئے
گئے اور کبھی کبھی درمیان میں رہا بھی کئے گئے لیکن مقدمہ ۱۸۷۱ء میں ایک ساتھ چلایا گیا۔
مولوی مبارک علی ۱۸۶۸ء میں مشتبہ خطوط کے سلسلے میں گرفتار کئے گئے۔ حاجی دین محمد،
پیر محمد، تبارک علی ۱۸۶۸ء، ۱۸۶۹ء اور ۱۸۷۰ء میں مختلف وارنٹوں کے ماتحت گرفتار
کئے گئے اور بار بار ممالک مغربی و شمالی (موجودہ صوبہ جات متحدہ) اور پنجاب کی جیلوں
میں منتقل کئے گئے[۲]

ایک مزے کی بات یہ ہے کہ مبارک علی، تبارک علی، امین الدین، حاجی دین محمد، جو
مختلف وقتوں (۱۸۶۸ء۔ ۱۸۶۹ء) میں شاہی قیدی[۳] STATE PRISONERS کی
حیثیت سے گرفتار کئے گئے تھے، جنوری ۱۸۷۱ء میں رہا ہوئے اور پھر اس مقدمے کے لئے
"از سرِ نو" گرفتار کئے گئے۔

لیکن جیسا کہ راقم نے ابھی عرض کیا، ان سب "اسیرانِ بلا" میں امیر خاں کا معاملہ
سب سے عجیب و غریب ہے۔ یہ پٹنہ محلہ عالم گنج کے رہنے والے اور کروڑ پتی تاجر تھے۔

---

[۱] وہ مقدمہ جس میں شہادت ایسی ہو کہ اس کی تردید کے لئے فریق مخالف کو لازماً جواب دہی کرنی پڑے۔
PRIMA FACIA کا لفظی ترجمہ ON THE FACE OF IT (بادی النظر میں) ہے۔

[۲] وہابی ٹرائل: ص ۱۴۲

[۳] سٹینڈرڈ انگلش اردو ڈکشنری میں اسٹیٹ پرزنر کا ترجمہ 'سیاسی قیدی' دیا ہے۔ جو مفہوم کو ادا نہیں
کرتا۔ راقم نے 'شاہی قیدی' فقرا تراشا ہے، مگر طبیعت مطمئن نہیں۔

ان کا چمڑے کا کاروبار بنگال اور بہار میں پھیلا ہوا تھا اور بڑے بڑے انگریز تاجر بھی
ان کا مقابلہ نہ کر سکتے تھے۔ ان کی تجارت تباہ کرنے اور ساری جائداد ضبط کرنے کے لیے
ان پر اتنا "شاندار مقدمہ" تصنیف کیا گیا، جس میں ۱۱۳ سرکاری گواہ پیش ہوئے اور
مسٹر ادکنلے جیسے "گرگ باراں دیدہ" کو سرکاری پیروکار مقرر کیا گیا۔ اس میں تو کوئی
شک نہیں کہ امیر خاں کو مجاہدین اور ان کے نصب العین سے لگاؤ تھا، خود حضرت
سید شہیدؒ یا مولانا ولایت علیؒ صادق پوری (ف ۱۲۶۹ھ) سے بیعت تھی اور جہاد
کے کاموں میں روپے سے مدد کیا کرتے تھے۔ زکوٰۃ کی رقمیں باضابطہ طور پر ادا کرتے۔
بنگال کے مشرقی اضلاع سے جو رقمیں آتیں، وہ بسا اوقات انہیں کے کلکتہ والے فرم کے
واسطے سے پٹنہ اور پنجاب کو بھیجی جاتیں۔ مگر حکومت نے انہیں سزا دینے اور انکی جائداد
کی ضبطی کے لیے جو کارروائیاں کیں، وہ اسی حکومت کے قانون دانوں اور ہوا خواہوں
کی نگاہ میں غیر منصفانہ اور خلافِ قانون تھیں۔

مسٹر ریہٹسک E. REHATSEK نے اس مشہور مقدمے کے متعلق جو کچھ لکھا
ہے، اس کا خلاصہ انہیں کے لفظوں میں پیش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، اس سے
اس مقدمہ سازش کی غرض وغایت، معلوم ہو جائے گی۔

"وہابی حکومت، نیز دوسرے مسلمان فرقوں کی نگاہوں میں جس
قدر بدنام ہیں، اس لئے امیر خاں اور حشمداد خاں نامی قیدیوں نے جنکا
مقدمہ جسٹس نارمن NORMAN کلکتہ ہائی کورٹ کے اجلاس میں پیش
ہوا تھا اور اپنے وہابی ہونے کا اقرار نہیں کیا۔ اسی لئے ایک پمفلٹ
"مشہور، وہابی مقدمہ THE GREATWAHABI کے مرتب کرنے والے
کہتے ہیں کہ "انھوں نے صرف مقدمے کا مشہور نام قائم رکھا ہے۔ ان کا یہ
مقصد نہیں کہ یہ لوگ واقعی وہابی ہیں۔ اس لئے کہ انھوں نے حلفیہ بیان
دیا ہے کہ یہ سُنّی ہیں [1]

---

[1] جنرل رائل ایشیاٹک سوسائٹی بمبئی: جلد ۱۴، ص ۳۷۵

اصل مقدمہ پٹنہ میں دائر ہوا تھا، جس کی پیروی مسٹر انگرام INGRAM نے کی۔ صرف ہیبس کورپس[1] HABEAS CORPUS کی سماعت کلکتہ میں ہوئی۔ مشہور بیرسٹر مسٹر انسٹی بمبئی سے کلکتہ لایا گیا۔ اور مقدمہ ۷ راگست ۱۸۷۱ء سے شروع ہوکر ۸ ستمبر کو ختم ہوا۔ مختلف وقفوں کے ساتھ مقدمے کی سماعت صرف نو روز ہوئی۔

امیر خاں، عمر ۵۷ سال، جو کہ چمڑے کا تاجر تھا، ریگولیشن ۳ ۱۸۱۸ء کے ماتحت گرفتار کیا گیا تھا۔ اس نے حسبِ ذیل درخواست اپنے وکیل کے ذریعہ دی :۔

"قیدی ملکہ کا ایک وفادار رعایا ہے۔ سالہا سال سے کلکتہ میں تجارت کرتا ہے۔ سنیچر، ۱۰ رجولائی ۱۸۶۹ء کو ایک بجے بغیر کسی قانونی LAW FUL وارنٹ کے اپنے جائے قیام کولوٹولہ[2] سے گرفتار کیا گیا . . . . اسے بالکل خبر نہیں کہ کیوں اور کس کے حکم سے وہ گرفتار ہوا ہے۔ حالانکہ اس نے وجہ دریافت کی تھی۔ وہ اپنے گھر سے ہوڑہ (ای، آئی ریلوے اسٹیشن) لایا گیا جو اس عدالت کے عدالتی اختیار سے باہر ہے۔ پھر وہ گیا (بہار) بھیجا گیا، جہاں وہ ۳ راگست ۱۸۶۹ء تک رہا۔ پھر اُسے علی پور جیل (کلکتہ) منتقل کردیا گیا۔"

---

[1] HABEAS CORPUS کے لفظی معنی HAVE THE BODY کے ہیں اور توضیح یہ ہے کہ اگر کسی شخص کو حکومت کی عاملہ یا پولیس وغیرہ خلاف قانون قید یا حبس میں ڈال دے تو اس شخص کو یا اس کی طرف سے ہر کسی شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ ہائی کورٹ کے کسی جج کے پاس جاکر درخواست کرے کہ فلاں شخص کو خلاف قانون محبوس کردیا گیا ہے۔ تو جج فریق ثانی کے نام حکم نامہ جاری کرے گا کہ وہ آکر وجہ بیان کرے کہ کیوں اس کے خلاف WRIT OF HABEAS CORPUS (محبوس شخص کی آزادی کا حکم) جاری نہ کیا جائے؟ اور اگر حابس کوئی قانونی وجہ نہ بیان کرسکے، جو جج کی نگاہ میں جائز ہو، تو جج رہائی کا حکم دے گا یعنی WRIT OF HABEAS CORPUS جاری کردے گا۔ مختصر طور پر یوں سمجھئے کہ HABEAS CORPUS ایک حق ہے جو LAW OF THE ENGLAND کے ماتحت تمام برطانوی رعایا کو حاصل ہے۔

[2] کلکتہ کا ایک آباد محلہ، جہاں زیادہ تر مسلمان تاجروں کی دکانیں اور آڑھتیں ہیں۔

دوسرے قیدی حشمداد خاں نے ۱۱ مئی ۱۸۷۰ء کو لفٹنٹ گورنر بنگال کی خدمت میں ایک میموریل پیش کیا کہ اُسے رہا کیا جائے یا جلد از جلد اس پر مقدمہ چلایا جائے۔ لفٹنٹ گورنر نے جواب دیا کہ نہ تو وہ رہا کیا جا سکتا ہے اور نہ مقدمہ ہی چلایا جا سکتا ہے۔ اور چونکہ وہ ریگولیشن III[1] کے ماتحت گرفتار کیا گیا ہے اس لئے نہ تو یہ معمول ہے اور نہ حکومت کی نظر میں ضروری ہے کہ اُسے وارنٹ کی نقل فراہم کی جائے۔

امیر خاں کے مقدمے کی پیروی پہلے مسٹر ANSTEY نے کی۔ پھر وہ بمبئی واپس چلا آیا۔ اس پر انگلش مین[2] نے یہ الزام لگایا کہ مسٹر ANSTEY فیس کی کمی کے باعث بددل ہو کر چلے گئے، جس کی انھوں نے تردید کی اور اس مقدمے کو "شرمناک"[3] بتایا۔"

آٹھویں دن جسٹس نارمن نے ایک لمبا فیصلہ سُنایا، جو شواہد و اقتباسات سے بھرا تھا، جس کا خلاصہ ان الفاظ میں کیا گیا تھا:

"وجوہ مذکورہ بالا کی بنیاد پر میری رائے یہ ہے کہ امیر خاں کو بذات خاص حاضر کرنے کے لئے HABEAS CORPUS کا حکم نامہ WRIT جاری کرنا ISSUE مناسب نہیں اور (جو کارروائی ہوئی ہے) اس سے قانون RULE کا منشا پورا ہو جائے گا جس کے تحت یہ کارروائی

---

[1] اس غیر معمولی حربے (ریگولیشن III، ۱۸۱۸ء) کے جواز میں ہنٹر صاحب نے اپنی کتاب کے پورے تین صفحے صرف کئے ہیں۔ یہ ریگولیشن موجودہ ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کا پیش رو ہے۔ یہ صوبہ بنگال میں رائج تھا۔ اس کے مقابلے میں صوبہ مدراس میں ریگولیشن II، ۱۸۱۹ء اور بمبئی میں ریگولیشن VIII ۱۸۱۸ء رائج تھے۔ چونکہ اس وقت کوئی مرکزی مجلس قانون ساز نہیں تھی اس لئے یہ ریگولیشن گورنر کے اختیار خاص سے جاری کئے جاتے تھے۔ ان سب کا مقصود وہی تھا جو آج ڈیفنس ایکٹ کی غرض بتائی جاتی ہے یعنی حکومت وقت کے خلاف منشار کارروائیوں کو ختم کرنے کے لئے امن عامہ کا تحفظ۔

[2] اس وقت کا مشہور نیم سرکاری اخبار۔

[3] THE SHAMEFUL CASE MICALLED WAHABI ENQUIRY

کی جا رہی تھی۔

اصل مقدمے کی پیروی مسٹر انگرام[1] INGRAM نے کی۔ یہ بڑا مشہور بیرسٹر تھا۔ اس کی آمدنی کا کم سے کم تخمینہ ایک لاکھ کیا جاتا ہے۔ پٹنہ سے کلکتہ انتقال کی درخواست دی گئی۔ لیکن ہائی کورٹ نے نامنظور کی۔ ایڈوکیٹ جنرل نے سپریم گورنمنٹ کی ہدایت کے بموجب انتقالِ مقدمہ کی سخت مخالفت کی۔

یہ مقدمہ ذاتی نوعیت اختیار کر گیا تھا۔ سرکاری حلقوں کا خیال یہ تھا کہ کسی نہ کسی طرح ان مجرموں کی سزا ہو جانا چاہیے۔ اور یہ کلکتہ میں ناممکن تھا۔

امیر خاں پہلے پہل مقدمہ سازش انبالہ کے دوران گرفتار ہوئے۔ میجر پارسن خاص طور پر انبالہ سے بھیجے گئے تھے۔ اور اسی نے خانہ تلاشی لی تھی۔ 'جرح' کے جواب میں اس نے یہ اعتراف کیا کہ وارنٹ کے بغیر اس نے خانہ تلاشی لی تھی۔ اور گرفتار کر کے مسٹر RELY کے گھر میں ایک شب رکھا گیا۔ پھر انہیں ہوڑہ بھیج دیا گیا۔[2]

"مقدمہ" کی روداد سے متعلق دو چار باتیں اور مسٹر ریٹسک REHATSEK کی زبان سے بھی سن لیجیے:۔

"امیر خاں پہلے پہل، ۱۸۶۴ء (رمضان ۱۲۸۰ھ مقدمہ انبالہ کے دوران) گرفتار کیا گیا۔ پھر ضمانت پر رہا کیا گیا۔ اس کے بعد ۱۸۶۹ء (ربیع الاول ۱۲۸۶ھ) میں گرفتار ہوا، اور پہلی مئی ۱۸۷۱ء تک (جب کہ ان کا مقدمہ پٹنہ میں شروع ہوا) کسی قانونی وارنٹ کے بغیر، صرف گورنر جنرل کی مرضی پر قید رکھا گیا۔"

---

[1] مسٹر انگرام کے علاوہ مسٹر لگنم LIGNAM اور مسٹر منڈس MENDES بعض دوسرے ملزموں کی طرف سے پیروکار تھے اور بعض ملزموں کی طرف سے کوئی وکیل نہیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ انبالہ (۱۸۶۴ء) سے لے کر پٹنہ (۱۸۷۱ء) تک دفاع کے تمام وکیل یورپین تھے۔

[2] وہابی ٹرائل: ص ۲۵-۲۶

"مقدمہ مئی، جون، جولائی، تین مہینے جاری رہا۔ شہادتوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قیدیوں کے متعلق بہت کم کہا گیا ہے، روپے کے معاملے میں امیر خاں بہت فیاض معلوم ہوتا ہے۔ لیکن یہ بہت دشوار معلوم ہوتا ہے کہ ان کا تعلق جہاد سے ثابت کیا جائے۔"

جولائی کے شروع میں حشمداد خاں کو پٹنہ کے سشن جج نے رہا کر دیا۔ اس لئے کہ ان کے خلاف الزام PRIMA FACIA CASE ثابت نہ ہو سکا۔ پیر محمد کو بھی رہا کر دیا گیا۔ جج کی رائے میں ان کے خلاف کافی شہادت نہ تھی۔

"باقی پانچ آدمیوں (بشمول امیر خاں) کو حبس دوام کی سزا ملی۔ اس معمر آدمی (امیر خاں) نے اپیل کی، لیکن بے سود۔ آخر اتنی ترمیم ہوئی کہ انہیں ہندوستان ہی میں رکھا جائے۔ ۱۸۷۹ء میں رہا کئے گئے اور شاید رہائی کے ایک یا دو دن بعد ان کا انتقال ہو گیا۔"[2]

امیر خاں کے مقدمے کی ساری اہمیت ان کی کروڑوں روپے کی جائداد کی وجہ سے تھی۔ آخر کیا بات ہے کہ انبالہ، پٹنہ، مالدہ اور راج محل کے مقدموں میں دو چار گواہوں سے سرکار کا کام چل گیا۔ مگر اس آخری مقدمے میں سرکار کو ملک کے طول و عرض سے ۱۱۳ گواہ بُلانا پڑے۔ اس پر بھی خود ایک انگریز مبصر کی زبان میں "ملزموں کے خلاف گواہوں نے بہت کم کہا۔"

وہ بیچارے کہتے ہیں؟ انہیں تو رَٹی ہوئی داستان سُنانا تھی۔ ۱۸۷۱ء کے مقدمے کی پوری روداد ہمارے سامنے ہے۔ راقم نے ان کا حرف بار بار پڑھا ہے۔ امیر خاں کے "جرم" کے اعتراف کے باوجود یہ کہنا پڑتا ہے کہ مقدمے کی روداد سے ان کا جرم مشتبہ ہو جاتا ہے۔

---

[1] ان میں سے اکثر گواہوں کو کافی انعامات بھی دے گئے (ملاحظہ ہو:- قاضی میاں جان مقدمہ انبالہ) کے بھائی قاضی مراد کی شہادت (گواہ انبالہ، پٹنہ، مالدہ، راج محل) (وہابی ٹرائل: ص ۲۶)

[2] جنرل رائل ایشیاٹک، بمبئی رہٹسک کا مقالہ۔

ہاں! تو جیسا کہ راقم نے عرض کیا، حکومت امیر خاں کی جائداد ضبط کرنا چاہتی تھی اور وہ اس نے کر کے دکھا دیا ــــ بعد کو "ضعیفی" کے باعث انہیں رہا کر دیا گیا۔ مگر جائداد کا ایک حبہ واپس نہیں ملا۔ مولوی محمد جعفر صاحب تھانیسری لکھتے ہیں:۔

"اپنے معمولی پرانے گواہوں سے جو چاہا، گواہی دلوا کر بیچاروں کو کالے پانی کو روانہ کیا اور امیر خاں کی چند کروڑ کی جائداد سے اپنا کل خرچہ پورا کر لیا۔ اگرچہ اس امیر خاں کو باوجود دائم الحبسی کے چار برس[1] بعد گورنمنٹ نے مفت کا احسان رکھ کے چھوڑ دیا اور ایک حبہ جائداد منضبط سے واپس نہ دیا۔ اگر چار برس پہلے الزام سے بری ہو کر چھوٹ جاتا تو اپنی کروڑوں کی جائداد منضبط بھی سرکار سے واپس لے لیتا[2]۔۔۔۔"

اس مقدمے کے دوران پولیس نے کیا کیا بدعنوانیاں کیں اور کس کس طرح بے گناہوں کو تنگ کیا، اس کا ہلکا سا اندازہ مسٹر پرنسپ H.T. PRINCIP سشن جج پٹنہ (۱۸۷۱ء) کے مندرجہ ذیل ریمارک سے ہوگا۔ مقدمہ انبالہ کی تفتیش کے سلسلے میں میجر پارسن، ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس انبالہ، کلکتہ تشریف لائے تھے اور ان کے مشورے سے امیر خاں کو گرفتار کر کے مسٹر کلکتہ کے گھر میں رکھا گیا۔ پھر چند مہینوں کے بعد انہیں چھوڑ دیا گیا اور کاغذات واپس کیے گئے ــــ یہ ساری کارروائی من مانی تھی۔ اس پہ سشن جج پٹنہ کا ریمارک ملاحظہ ہو:۔

"مصاحب علی (امیر خاں کا ملازم) اور امیر خاں خانہ تلاشی کے بعد رات کو مسٹر ریلی کے گھر لے جائے گئے۔ امیر خاں سے ضمانت لی گئی اور باقی اسی شام کو میجر پارسن کے ساتھ انبالہ بھیجے گئے۔ یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مسٹر ریلی

---

[1] REHATSEK ۱۸۷۵ء میں رہائی کا ذکر کرتا ہے۔ گویا سزا یابی کے آٹھ برس بعد۔ رسالہ اشاعت السنہ (جلد ۵ صفحہ ۱۲) میں رہائی کی تاریخ ۱۸۷۵ء دی گئی ہے۔

[2] تواریخ عجیب: ص ۷۷

کے گھر پر چند مہینے حاضر رہنے کے بعد امیر خاں کو چھوڑ دیا گیا۔ اور ان کے خطوط و کاغذات جو مسٹر ریلی کے ہاتھ سے آگے نہیں بڑھے، واپس کیے گئے۔ میں ان کارروائیوں کا ذکر کر رہا ہوں اس لیے کہ یہ سب بالکل غیر قانونی تھیں اور گو موجودہ مقدمے پر ان کا فوری اثر نہیں پڑتا، ان کو نظر انداز کرنا مناسب نہ ہوگا۔ اس لیے کہ اگر ہندوستان میں سراغ رسانی کی پولیس رکھنا مطلوب ہے، تو اس کے افسروں، پولیس افسروں کے عام قانون سے اپنے کو برتر نہیں سمجھنا چاہیے۔ اور بہت ممکن ہے کہ ان معاملات میں بے لگام آزادی اختیارات کے غلط اور ناروا استعمال پر منتج ہو[1][2]

بعضے دوسرے گرفتارانِ بلا

اوپر سازش کے پانچ مقدموں کا مختصر ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ صرف یہی حضرات قید و محن میں مبتلا کیے گئے۔ ۱۸۴۹ء سے ۱۸۷۱ء تک گرفتاریوں کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ بڑی تعداد "کچھ لے دے کر" چھوڑ دی گئی۔ کچھ بے قانون اور بے سزا حوالات اور جیلوں میں سڑتے رہے۔ ایک اچھی خاصی جماعت وعدہ معاف گواہ بننے پر مجبور کی گئی۔ ۱۸۷۱ء کے مقدمے کی "روداد" پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ الٰہی بخش (برادرِ حقیقی میر مقصود علی امیر المجاہدین، ت ۱۲۷۶ھ) قاضی مراد (برادرِ حقیقی قاضی میاں جان

---

[1] ایک طرف پولیس افسروں کی یہ زیادتیاں ہیں۔ دوسری جانب سرکار کی ان پر خاص نوازش کا بھی حال سُن لیجیے۔ ایشری پرشاد، پولیس انسپکٹر، پٹنہ (۱۸۶۴ء) جس نے انبالہ (۱۸۶۴ء) پٹنہ (۱۸۶۵ء) کے مقدموں میں کارہائے نمایاں انجام دیے اور امیرانِ بلا کو دوبارہ "پھانسنے" کے لیے اس نے انڈمان تک کا سفر کیا، کی ترقی کی سفارش خود راونشا نے اپنی یادداشت (دفعہ ۳۴) میں کی تھی۔ جو قبول ہوئی اور غالباً انہیں ڈپٹی کلکٹر بنایا گیا۔ نیز لفٹنٹ گورنر بنگال بہادر نے مزید ڈھائی ہزار کے نقد انعام کی سفارش کی (مراسلہ مسٹر A. EDEN سکریٹری گورنمنٹ بنگال بنام کمشنر پٹنہ ڈویژن۔ مورخہ ۲۶ جولائی ۱۸۶۵ء)۔

[2] وہابی ٹرائل: ص ۱۶۶

متہم سازش انبالہ) الٰہی بخش، محمد شفیع، عبدالکریم (سزا یافتگانِ انبالہ) عبداللہ قواعدی (جو مجاہدین کو قواعد سکھانے پر مامور تھا)۔ قاری امداد علی (ایک ممتاز جہادی کارکن) اور ان جیسے بیسوں دوسرے آزمودہ کارکنوں کی "گواہیاں" پڑھ کر عبرت ہوتی ہے۔ اور ان بیچاروں پر ترس آتا ہے۔ اللہ جانے کن کن دھمکیوں اور سختیوں کے بعد یہ غریب اس "گناہ" پر تیار ہوئے ہوں گے! لغزش تو بہرحال لغزش ہے۔ مگر بعض ایسے موقعے آتے ہیں کہ 'مجرم' پر غصے کے بدلے ترس آتا ہے۔ یہی حال راقم کا ان غریبوں کے ساتھ ہے۔ جانے اُن حالات میں ہم ہوتے تو کیا کرتے۔

ہاں! تو عرض یہ کر رہا تھا کہ گرفتارانِ بلا ان مقدموں کے استنہاری مجرموں میں محدود نہیں۔ مثال کے طور پر مسعود خاں ساکن بوگرا (بنگال) کو لیجئے، یہ ۱۸۶۰ء میں گرفتار ہوئے اور ۱۸۸۳ء میں مولانا عبدالرحیم (ف ۱۳۴۱ھ) وغیرہ کے ساتھ رہا ہوئے[1]۔ مگر انکی گرفتاری اور مقدمے کا کہیں ذکر نہیں آتا۔

ان کے علاوہ ان سینکڑوں بلکہ ہزاروں بے گناہوں کے مصائب کا اندازہ کرنے کے لئے، جو خلافِ قانون جیلوں میں ڈال دئے گئے تھے، ہنٹر کا یہ بیان ملاحظہ کیجیے:۔

"اس وقت (یعنی ۱۸۷۱ء میں) بنگال جیل میں ایک سفید ریش مسلمان ہے، جس کی زندگی ہر طرح پاک ہے۔ لیکن وہ انتہا پسند باغی ہے۔ تیس سال سے اس کی بغاوت کا

---

[1] آخر میں صرف چھ ملزم جزائر انڈمان میں رہ گئے تھے۔ مولانا یحیٰی علی (ف ۱۲۸۴ھ، ۱۸۶۸ء) اور مولانا احمداللہؒ (ف ۱۲۹۸ھ، ۱۸۸۱ء) دونوں بھائی تو وہیں خواب استراحت میں مصروف ہیں۔ قاضی میاں جان انبالہ ہی میں وفات پا گئے (۱۲۸۱ھ، ۱۸۶۵ء)۔ ۱۳۰۰ھ، ۱۸۸۳ء میں لارڈ رپن (۱۸۸۰ء-۱۸۸۴ء) وائسرائے ہند کے حکم سے جو لوگ رہا ہو کر وطن لوٹے، ان کے نام یہ ہیں ——— (i) مولانا عبدالرحیم (متہم بمقدمہ انبالہ:- ف ۱۳۴۱ھ (ii) مولوی محمد جعفر تھانیسری (متہم بمقدمہ انبالہ ف ۱۹۰۵ء) (iii) میاں عبدالغفار (متہم بمقدمہ انبالہ:- تقریباً ف ۱۳۳۳ھ (iv) مولوی امیرالدین (متہم مقدمہ مالدہ) (v) مولوی تبارک علی (متہم مقدمہ پٹنہ:- ف تقریباً ۱۳۱۷ھ (vi) مسعود خاں ساکن بوگرا (بنگال) اسیر ۱۸۶۰ء)

حال معلوم تھا اور وہ بھی جانتا تھا کہ اس کا حال چھپا ہوا نہیں۔ ۱۸۴۹ء میں اُسے باضابطہ دھمکی دی گئی۔ ۱۸۵۳ء اور ۱۸۵۷ء میں اس کا اعادہ کیا گیا۔ ۱۸۶۴ء میں اسے مجسٹریٹ کی عدالت میں آخری طور پر نصیحت کے لئے بلایا گیا۔ اس نے ان تمام تنبیہوں کا ذرہ برابر خیال نہ کیا۔ آخر ۱۸۶۹ء میں وہ ذاتی حراست PERSONAL RESTRAINT میں رکھا گیا۔ ایسے مقدمات کو نبٹانا بہت مشکل ہے۔ اپنے عقیدے کے مطابق متقی اور مخلص لوگوں کے خلاف کارروائی کرتے ہوئے حکومت خود گھبراتی ہے۔ کم از کم یہ کیا جا سکتا ہے کہ ان کا زہر دوسروں تک نہ پہنچنے پائے اور وہ بھی صرف معمولی پابندی کے ساتھ۔[۱]

ایسی مثالیں اور بھی دی جا سکتی ہیں۔ پر جگہ اور وقت کی تنگی قلم روکنے پر مجبور کرتی ہے۔

---

[۱] ۔ ص ۱۰۳

ساتواں باب

اسیرانِ بلا کے مصائب اور ان کی استقامت

مجاہدین میں سے جو جامِ شہادت سے سیراب ہوئے ہیں، وہ دین و دنیا دونوں میں اچھے رہے۔ آخرت میں ان کے مرتبے کا حال تو اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے، پر ایک دنیادار کی مادی نگاہیں بھی اتنا دیکھ سکتی ہیں کہ وہ ایک غیر الٰہی نظامِ حکومت کے ناخدا ترس عمّال کے جور و ظلم سے بچ گئے۔ جہادِ سرحد کے شہیدِ اوّل[۱] باقر علی عظیم آبادی سے لے کر ان لاتعداد اور گمنام شہیدوں تک جو مختلف حملوں اور خونی معرکوں میں سفّاک دشمن کے مشقِ ستم کا نشانہ بنے، سب نے اپنا اپنا حق ادا کیا، اور اللہ نے چاہا تو وہ رضائے الٰہی سے سرفراز ہو چکے ہوں گے۔ بگران ہزاروں بے گناہوں کے غم و آلام کو بھی فراموش نہ کرنا چاہیے، جو طرح طرح کی مصیبتوں سے دوچار ہوئے۔ قسم قسم کی اذیتیں برداشت کیں اور پھر آزمائش میں کامیاب اُترے، یعنی ان کے

---

۱ دیکھو سیرت سید احمد شہید: ص ۱۴۷، طبع دوم، یہ حضرت سید شہیدؒ کے مرید اور مولانا ولایت علیؒ صادق پوری کے چچازاد بھائی تھے۔ سیرت سید احمد شہید: ص ۳۸۷) کے لائق مصنف نے سید صاحبؒ کے خلفاء میں ان کا نام دیا ہے۔ خلافت کے متعلق تو قطعی طور پر نہیں کہہ سکتا، البتہ اتنا واقعہ ہے کہ یہ مولانا ولایت علی (ف ۱۲۶۹ھ) کے چچازاد بھائی تھے اور مولانا ولایت علی، مولانا عنایت علی (ف ۱۲۷۴ھ) مولانا فرحت حسین (ف ۱۲۷۴ھ) اور مولوی فخرالدین شہید (بالاکوٹ: ۱۲۴۶ھ) وغیرہم کے ہمراہ حضرت سید صاحبؒ سے بیعت ہو چکے تھے۔ جب سرحد پر سکھوں سے جنگ شروع ہوئی تو سب سے پہلے جو اللہ کا بندہ اس کی راہ میں کام آیا وہ یہی باقر علی عظیم آبادی تھے۔ رحمۃ اللہ و نور ضریحہ۔

قدم ہر منزل پر لغزش سے ناآشنا اور سینے نورِ ایمان سے روشن رہے اور ان کے دل جذبۂ فدویت سے کبھی خالی نہیں ہوئے۔ ان مجاہدینِ راہِ حق کی داستانِ درد بہت طویل ہے اور دردانگیز بھی۔ قیدیوں اور جلاوطنوں کی روداد الم پڑھ کر بدن کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ کبھی موقع ملا تو جی کڑا کرکے یہ ساری رودادِ الم سُنادی جائے گی۔ لیکن سچی بات تو یہ ہے کہ اب سننے سُنانے کا وقت گذر چکا۔ وقت کی تیز رفتاری اپنے حال پر ہے۔ اس کی فطرت انتظار کرنا نہیں جانتی۔ موقع عمل کا ہے۔ وقت آگیا ہے کہ پھر ازسرِنو اس رسم کہن کو زندہ کیا جائے۔

عمریست کہ آوازۂ منصور کہن شد من ازسرِ نو جلوہ دہم دار و رسن را

مگر جب داستان چھڑ گئی ہے تو پھر چند بکھرے ہوئے اوراق نذرِ ناظرین ہیں۔ خوش قسمتی سے اس راہ کے دو مسافر اپنی رودادِ سفر کا ایک حصّہ ہماری عبرت و بصیرت کے لئے چھوڑ گئے ہیں۔

ہماری مراد مولوی عبدالرحیم صاحب صادق پوری کی تذکرہ صادقہ اور مولوی محمد جعفر صاحب تھانیسری کی تواریخ عجیب سے ہے۔ سرِ دست ہم انہیں کتابوں سے کچھ اقتباس پیش کرتے ہیں جس سے ان مصائب کی ہلکی سی جھلک معلوم ہو گی، جو ان شیفتگانِ راہِ صداقت پر توڑے گئے۔ ان دونوں صاحبوں نے جزائرِ انڈمان سے واپسی (۱۳۰۰ھ، ۱۸۸۳ء) کے بعد یہ کتابیں لکھی ہیں۔ اس لئے قدرتی طور پر وہ اپنے اصلی خیالات و تاثرات[1] نہ ظاہر کرسکے

---

[1] ڈاکٹر محمود حسین خاں لیکچرر ڈھاکہ یونیورسٹی کا ایک مختصر مضمون "ہندوستانی وہابیوں کی سیاست" مارننگ نیوز، کلکتہ کے عید نمبر (۱۳۶۳ھ، ۱۹۴۴ء) میں شائع ہوا ہے۔ اس میں انھوں نے مولوی محمد جعفر صاحب تھانیسری کو ان لوگوں میں شمار کیا ہے، جو یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ "سید صاحب" کو انگریزوں سے مطلق پرخاش نہیں تھی اور مسلمانوں کو اس حکومت سے کوئی شکایت نہیں "مولوی محمد صاحب اور مولوی عبدالرحیم صاحب، دونوں نے اس طرح کی باتیں ضرور لکھی ہیں، مگر ان کی کتابوں کا پڑھنے والا یہ محسوس کر لیتا ہے کہ "فلاں بات کیوں کہی گئی ہے؟" ـــ اور "بین السطور" سے تو تمام باتیں سمجھ میں آجاتی ہیں۔ ڈاکٹر محمود حسین خاں اس "پس منظر" سے ناواقفیت کے باعث یہ رائے قائم کرنے میں "معذور" کہے جاسکتے ہیں۔

ہوں گے۔ پھر بھی ضمنی طور پر ان بزرگوں نے جو کچھ لکھا ہے، اس سے نشانِ راہ کا پتہ لگتا ہے۔ اور مجاہدین کی مصیبتوں کا کچھ اندازہ ہو جاتا ہے۔

مولانا یحییٰ علی، مولانا عبدالرحیم اور ان کے رفقا پہلے انبالہ جیل میں رکھے گئے جہاں ان کا مقدمہ ایک عرصہ تک چلتا رہا، وہاں ان کے ساتھ جو برتاؤ ہوا وہ مولوی عبدالرحیم صاحب کی زبانی سنئے:۔

"ہر ایک علیٰحدہ علیٰحدہ ایک کوٹھری میں کہ جس کو سنگین کوٹھری کہتے ہیں، بند کر دیئے گئے۔ وہ کوٹھری پانچ فٹ لانبی اور چار فٹ چوڑی ہوگی۔ اور چھت اس کی نہایت بلند اور اوپر چھت کے ایک چھوٹا سا روشن دان تھا کہ آدمی اس میں سانس لے سکے۔ نہایت تنگ و تاریک تھی۔ اس کوٹھری میں تقریباً ڈھائی تین مہینے ہم لوگ رہے۔ جملہ گیارہ آدمی تھے۔ شب و روز میں ایک بار اس کا دروازہ کھلتا اور ایک جمعدار اور تین سپاہی اور ان کے ساتھ ایک باورچی کہ جس کے ہاتھ میں روٹیاں اور دال ہوتیں اور ایک سقّہ کہ جس کے مشک میں پانی ہوتا اور ایک بھنگی ہاتھ میں گملا لئے ہوئے آتا اور ہر ایک کوٹھری کو کھولتا۔ باورچی دو روٹیاں اور کچھ دال دے دیتا اور سقّہ ایک کوزہ پانی دیتا اور بھنگی گملا صاف کر دیتا اور پھر یہ لوگ چلے جاتے۔ جو جو تکلیفیں اس میں گذریں، اس کا بیان طویل ہے اور فضول۔ بعد تین مہینے کے جب مقدمہ ہم لوگوں کا اجلاس میں صاحب مجسٹریٹ کے شروع ہوا۔ اس وقت ہم گیارہ آدمی قبروں سے نکال کر ایک مکان حوالات میں جمع کر دیئے گئے جو اسی جیل خانہ میں تھا۔ بعد تین مہینے کے ہم لوگوں نے آسمان کی صورت دیکھی اور ایک کو دوسرے سے ملاقات ہوئی۔ از حد خوشی حاصل ہوئی۔"[1]

---

[1] تذکرہ صادقہ: ص ۶۸-۶۷

آج کل تو قید خانوں میں سیاسی ملزموں کے لیۓ درجے مقرر ہیں۔ تیسرے درجے میں بھی سیاسی قیدیوں کے ساتھ حیوانوں کا برتاؤ نہیں کیا جاتا۔ لیکن ان علمار مجاہدین کو جیل میں پیٹ بھر کر کھانا بھی نہیں دیا جاتا تھا۔ اللہ کے بندے انبالہ جیل میں گھاس پتّوں پر گذارہ کرنے پر مجبور ہوئے۔

اس قدر بھوک کا غلبہ سب لوگوں کو رہتا کہ دو دو روٹیاں سرکار سے ملتیں۔ ان کے کھانے سے یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ کچھ کھایا بھی ہے یا نہیں؟ جیل میں جس قدر گھاس تھی، مع بیخ اُکھاڑ کر قیدی لوگ چٹ کر گئے۔ ہر طرف الجوع الجوع، ہائے بھوک کا شور تھا[1]۔

انبالہ میں سزا پا لی کے بعد اسیرانِ بلا لاہور جیل کو منتقل کئے گئے، مگر کس شان سے؟ مولوی محمد جعفر صاحب لکھتے ہیں :۔

"۲۲ فروری ۱۸۶۵ء کو ہم جیل لاہور کو روانہ ہوئے۔ گیروا لباس جوگیانہ صورت، کمبل اوڑھے ہوئے بیڑی، ہتھکڑی کے زیور سے آراستہ پیراستہ ہم منزل در منزل کوچ در کوچ چلے جاتے تھے۔ دو ایک گاڑیاں بھی ہمارے ساتھ تھیں۔ بقدر تیس چالیس قیدیوں کے ہم جیل انبالہ سے روانہ ہوئے تھے۔ سب پا پیادہ چلتے تھے، جب کوئی تھک جاتا تو اس کو گاڑی پر بھی سوار کر لیتے۔ ورنہ پا پیادہ خلخال آہنی کو چھن چھناتے چلے جاتے[2]"

لاہور پہنچ کر گرفتارانِ الم کی مصیبتوں میں اور اضافہ ہو گیا :۔

"قریب تین بجے شام کے ہم لوگ سنٹرل جیل لاہور کے دروازے پر پہنچے اور ہمارے چالان کے کل قیدی ایک قطار کر کے دروازہ جیل پر بٹھلا دیئے گئے۔ اوّل ایک کشمیری ہندو داروغہ آیا۔ اس نے پہلے ہمارے مقدمے

---

[1] تذکرہ صادقہ : ص ۷۳ [2] تواریخ عجیب : ص ۷۹

والوں کو بغور تمام دیکھا اور کسی قدر افسوس بھی کیا۔ اس کے بعد ڈاکٹر
گرے صاحب سپرنٹنڈنٹ جیل رونق افروز ہوئے۔ انھوں نے سب سے
اوّل ہم لوگوں کو ملاحظہ کیا اور بڑے غصّہ سے حکم دیا کہ ایک آڑا ڈنڈا بھی
ان لوگوں کے پاؤں میں ڈال دو۔ چنانچہ بمجرد صدور اس حکم کے لوہار ڈنڈے
آہنی لے کر حاضر ہوگئے۔ اور ہمارے دونوں پاؤں کے دونوں کڑوں کے
درمیان سے ایک ایک آڑا ڈنڈا جو ایک فٹ سے زیادہ لمبا نہ تھا، ڈال
دیا گیا۔ یہ حکم ازراہِ تعصب فقط ہم ہی لوگوں کے واسطے تھا اور تمام جیل گھر
میں ہم نے کسی قیدی کے پاؤں میں یہ ڈنڈا نہیں دیکھا۔ چلنا پھرنا، اُٹھنا
بیٹھنا نہایت مشکل ہوگیا اور رات کو پاؤں پسار کر سونا بھی محال تھا۔"[1]

یہ تو لاہور جیل کا عطیہ تھا۔ انڈمان جاتے ہوئے ملتان اور کراچی
کے درمیان ایک اور زنجیر کا اضافہ ہوا:۔

"اور سوا بیڑی اور ہتھکڑی اور ڈنڈے کے، جو پہلے سے سب زیب
تن تھے، یہاں ایک بڑی موٹی زنجیرِ آہنی بھی ہماری بیڑیوں کے بیچ میں
سے پہنائی گئی، جس سے اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھے ہوئے پاخانہ پیشاب کرتے
رہے۔ اس وقت قریب آدھا آدھا من کے لوہا ہمارے جسم پر تھا۔ باوجود
اس قدر کثرت پانی کے کہ دریائے سندھ ہمارے زیرِ پا تھا۔ ہم پڑے
پڑے تیمم سے نماز پڑھتے تھے۔"[2]

ان مظالم کے علاوہ مقدمہ کے دوران گرفتارانِ بلا اور ثابت قدم گواہوں پر جو
سختیاں کی گئیں وہ بیان سے باہر ہیں۔ مثال کے طور پر ایک دو واقعے لکھے جاتے ہیں:۔

"لیکن اکثر گواہ گواہی دیتے وقت بھی ہمارے منہ کو دیکھ کر زار زار
روتے بھی جاتے تھے، مگر بے بس۔ اگر گواہی نہ دیں تو قطع نظر مار پیٹ کے

---

[1] تواریخ عجیب: ص ۵۰ [2] تواریخ عجیب: ص ۵۳

پھانسی کا سامنا تھا، اور مار پیٹ کی تو یہ حالت تھی کہ عباس نام کا ایک لڑکا جو مدت تک میرے گھر میں رہ کر پرورش پایا تھا، جب مجسٹریٹی میں گواہی دیتے وقت مجھ کو دیکھ کر مارے محبت کے جھوٹے اور آموختہ بیان میرے اوپر کرنے سے ہچکچایا، تو اسی روز رات کو اس کو ایسی سخت سزا دی گئی کہ وہ بچہ اسی صدمے سے قبل از در پیشی مقدمہ سیشن کے مر گیا۔[۱]...

یہ تو پیشی کے دوران کے مظالم تھے۔ مقدمے کی پیشی سے پہلے بعض بزرگوں پر جو ناروا مصیبتیں روا رکھی گئیں، ان کے سننے کے لئے پتھر کا کلیجہ چاہیے۔ مولوی محمد جعفر صاحب اپنی آپ بیتی لکھتے ہیں۔ پڑھیے اور اپنا ایمان تازہ کیجیے۔

"دوسرے دن فجر کے وقت پارسن صاحب آئے اور مجھ سے کہا کہ تم اس مقدمہ کا سب حال بتلا دو۔ تمہارے واسطے بہت بہتر ہوگا ——

پارسن صاحب نے مجھ کو پہلے بہت دھمکایا اور پھر مارنا بھی شروع کیا جب میری مار حد کو پہنچی اور میں گر پڑا.... اور جب اس قدر مار پر بھی میں نے کچھ نہ بتلایا تو وہ سب کے سب مایوس ہو کر چلے گئے۔ میں نے جب یہ کیفیت ظلم اور تعدی کی دیکھی تو مجھ کو یقین ہو گیا کہ اب مجھ کو یہ لوگ زندہ نہ چھوڑیں گے۔ میرے ذمے کچھ روزے رمضان کے باقی تھے۔ دوسرے دن سے ان کی قضا رکھنی شروع کر دی۔ اس کے بعد پارسن صاحب مجھے ڈپٹی کمشنر کے بنگلے پر لے گئے اور وہاں فہمائش سے مایوس ہو کر انھوں نے اپنی آخری حسرت بھی نکال لینا چاہی۔"

"میں نے اس چاپلوسی پر بھی انکار کیا تو پھر پارسن صاحب مجھ کو ایک الگ کمرے میں لے گئے جہاں لے جا کر پھر مارنا شروع کیا، میں کہاں تک لکھوں؟ آٹھ بجے صبح سے آٹھ بجے رات تک مجھ پر اس قدر مار پیٹ

---

[۱] تواریخ عجیب: ص ۳۵

ہوئی کہ شاید کسی پر ہوئی ہو۔ لیکن بفضلِ الٰہی میں سب سہار گیا۔ مگر اپنے
رب سے ہر دم یہ دعا کرتا جاتا تھا کہ اے رب یہی وقت امتحان کا ہے، تو
مجھ کو ثابت قدم رکھیو۔ . . . (ص ۸)

یہ صبر آزما حالات تھے، جن میں ان مردانِ خدا نے استقامت وضبط کا دامن
ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ اور یہی تکلیفیں تھیں جن سے گھبرا کر محمد شفیع، الٰہی بخش وغیرہ بعد کو
سرکاری گواہ بن گئے، مگر ان سب میں ایک اللہ کا بندہ ایسا تھا جو سب سے ممتاز تھا
جس کی استقامت میں صحابہ کا رنگ جھلکتا تھا۔ اس کی للہیت، جاں سپاری اور فدویت
و عبدیت" کے اس مقام تک پہنچ گئی تھی جس کا تصور بھی اس دور میں مشکل ہی سے
کیا جا سکتا ہے۔

میری مراد مولانا یحییٰ علی جعفری صادق پوری سے ہے۔ یہ سید صاحبؒ کے رنگ
میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ان کے حالات پڑھ کر حضرت خبیبؓ، حسین بن علی (رضی اللہ عنہم)
اور احمد بن حنبلؒ (ف ۲۴۱ھ) کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ جب سے ہوش سنبھالا اپنے
امیر مولانا ولایت علی (ف ۱۲۶۹ھ) کی معیت کبھی نہ چھوڑی۔ سفر، حضر میں ہمیشہ ان کے
ساتھ رہے۔ گلاب سنگھ سے جو لڑائیاں ہوئیں، ان میں بھی آپ شریک تھے۔ دوسری مرتبہ
بھی سفر ماورائے سرحد میں آپ ساتھ رہے — پھر نظمِ جماعت کا کام آپ نے اپنے ہاتھ میں
لیا۔ مولانا عنایت علیؒ (ف ۱۲۷۴ھ)، مولانا فرحت حسینؒ (ف ۱۲۷۴ھ) اور شاہ محمد حسین
صاحبؒ (ف ۱۲۷۶ھ) خلفائے سید شہیدؒ کے پے در پے وفات کی وجہ سے تنظیم و تبلیغ کا
سارا بار آپ کے کندھوں پر پڑ گیا۔ جسے آپ حیرت انگیز قابلیت اور معاملہ فہمی کے ساتھ اپنی
گرفتاری کے وقت (۱۲۸۰ھ، ۱۸۶۴ء) تک چلاتے رہے۔ جیل اور قید میں بھی آپ کا رنگ
سب سے الگ تھا۔ تکلیفیں اوروں نے بھی برداشت کیں۔ پر حسین ابن علیؓ اور احمد بن حنبلؒ
مولانا یحییٰ علیؒ کے صبر و استقامت کا حال سنیے:۔

"ہمارے حضرت مولانا کا صبر و استقلال اس وقت کا قابلِ دید تھا۔
شب کو میں اور آپ ایک جگہ رہتے۔ آپ پچھلی شب حسبِ معمول نماز، دعا وغیرہ

میں مشغول رہتے۔ اور اکثر اشعارِ عاشقانہ، دیوان شاہ نیاز و حافظ وغیرہ کا پڑھتے اور ایک نہایت وجدی کیفیت آپ پر طاری ہوتی۔ ہم لوگ سب ہوش باختہ ہوتے اور آپ نہایت مسرور و خوش۔ آپ کے چہرہ بشرہ سے کچھ بھی آثارِ رنج و محن کے پائے نہیں جاتے۔ ذکر اللہ سے رطب اللسان رہتے۔ آپ اکثر اس شعر سے بھی جو حضرت خبیبؓ صحابی کا ہے، مترنم ہوتے:

ولست اُبالی حین اُقتل مسلماً   علیٰ ایّ شقٍ کان فی اللہ مصرعی

وذٰلک فی ذات الاله وان یشاء   یبارک علیٰ اوصال شلو ممزع

(جب میں اسلام کی حالت میں قتل کیا جاؤں، تو مجھے اس بات کی پروا نہیں کہ اللہ کی راہ میں کس پہلو میری جان نکلتی ہے۔ یہ سب اللہ کی راہ میں ہے، وہ چاہے تو بوسیدہ (ٹکڑے ٹکڑے) جسم کے اعضا میں برکت اور بالیدگی دے۔)

میرے پاس ایسے الفاظ نہیں ہیں کہ جن سے آپ کی اس کیفیتِ وجدی و صبر و شکر کا ایک کرشمہ بھی بیان کرسکوں اور اس کی تصویر کھینچ کر ہدیہ ناظرین کرنا تو محال ہے۔"[1]

ایک معمولی سا واقعہ ہے۔ معمولی اس لحاظ سے کہ سب اسیرانِ بلا صبر و شکر کے ساتھ برداشت کر گئے۔ مگر ایک عاشقِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) پر اس کا کچھ اور ہی اثر ہوا۔ جب انبالہ میں پھانسی کی سزا حبس دوام سے بدل دی گئی اور ان مشتاقانِ شہادت کو حکومت نے بزعم خود "محروم" رکھنا چاہا تو ان کو عام قیدیوں کے ساتھ کر دیا گیا اور لباس وغیرہ میں تبدیلی کے ساتھ داڑھیاں بھی کتر دی گئیں، اس کا حال سنئے اور سینوں پر ہاتھ رکھ کر اپنے ایمان کا جائزہ لیجیے:۔

"۱۶ ستمبر ۱۸۶۴ء کو ڈپٹی کمشنر صاحب پھانسی گھروں میں تشریف

---

[1] تذکرہ صادقہ: ص ۷۰

لائے اور چیف کورٹ کا حکم پڑھ کر سُنایا کہ تم لوگ پھانسی پڑنے کو بہت دوست رکھتے ہو، اور شہادت سمجھتے ہو۔ اس واسطے سرکار تمہاری دل چاہتی سزا تم کو نہیں دیوے گی۔ تمہاری پھانسی سزائے دائم الحبس بعبور دریائے شور سے بدل گئی۔ بمجرد سنانے اس حکم کے پھانسی گھروں سے دوسرے قیدیوں کے ساتھ بارکوں میں ملا دیا اور جیل خانہ کے دستور کے موافق مقراض سے ہماری داڑھی، مونچھ اور سر کے بال تراش کر منڈی بھیڑ سا بنا دیا۔ اس وقت میں نے دیکھا کہ مولوی یحییٰ علی صاحب اپنی داڑھی کے کترے ہوئے بالوں کو اٹھا اٹھا کر کہتے کہ افسوس نہ کر کہ تو خدا کی راہ میں پکڑی گئی اور اس کے واسطے کتری گئی۔"[1]

مولاناؒ کا صبر و استقلال ہر منزل اور ہر قدم پر یکساں تھا۔ پھانسی کی سزا ہو چکی ہے۔ قید تنہائی سے سرفراز ہیں۔ مگر سنتِ یوسفؑ سے غافل نہیں۔ جب بھی موقع ملتا ہے، اللہ کا پیغام پہنچانے سے باز نہیں آتے۔

"چنانچہ ہمارے حضرت اس قید تنہائی میں بھر تخمیناً دو ڈھائی مہینے رہے اور نہایت صبر و استقلال کے ساتھ ان ایام کو آپ نے بسر کیا، اور جب کوئی سپاہی پہرے والا یا اور کوئی سپاہی یا قیدی آپ کے سامنے آجاتا، ہندو یا مسلمان، سب کو آپ توحید باری کا وعظ سُناتے، اور عذابِ آخرت و قبر وغیرہ سے ڈراتے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سپاہی جو پہرے کے واسطے آتا، وہ سکھ ہوتا یا گورکھا اور مسلمان نہ ہوتا (تو) آپ اس آیتِ کریمہ کا وعظ سُناتے ـــــــ ءارباب منفرقون خیرٌ ام اللہ الواحد القہار[2] سپاہی کھڑا روتا اور جب اس کے پہرے کی بدلی ہوتی، تو اس صحبت

---

[1] تواریخ عجیب: ص ۴۴

[2] یوسفؑ متفرق معبود اچھے یا ایک معبود برحق جو سب سے زبردست ہے وہ اچھا ہے

کو چھوڑ کر جانا پسند نہیں کرتا۔ میں کچھ نہیں لکھ سکتا کہ کس قدر فائدہ اس وقت پہرے والوں کو پہنچا اور کتنے موحد ہو گئے۔ اور کتنے دین آبائی کو چھوڑ کر مسلمان ہو گئے۔ لا یعلم الا اللہ۔۔۔۔ آپ کا جسم مبارک قیدی تھا، مگر آپ کے دل و زبان آزاد تھے۔ اس پر کسی کی حکومت نہ تھی، بجز اس حاکم حقیقی کے۔ اگر دو منٹ کے واسطے بھی کوئی آدمی سامنے آجاتا، آپ امر بالمعروف، و نہی عن المنکر بجا لاتے۔"[۱]

ابھی آپ داڑھی کتروانے کا حال پڑھ چکے ہیں۔ اب تشدد اور مشقت پر بھی ذرا اس "مردِ مومن" کی استقامت کا حال سنیے:۔

"صبح کو کپتان ٹائی صاحب مجسٹریٹ و ڈپٹی کمشنر انبالہ و پارسن صاحب سپرنٹنڈنٹ پولیس جیل میں آئے اور داروغہ کو حکم دیا کہ مولانا سے سخت تر مشقت لی جاوے۔ چنانچہ خود اس نے اپنے روبرو کھڑے ہو کر ایک بڑے کنویں پر جو رہٹ چل رہا تھا عین تمازتِ آفتاب میں اس رہٹ کو آٹھ دس قیدی چلا رہے تھے۔ آپ کو بھی اس میں دے دیا۔ آپ دو تین روز تک تمام روز اس کو چلاتے رہے۔ آپ کو بباعث حرارتِ آفتاب خون کا پیشاب آنے لگا۔ آپ نہایت صبر و شکر سے اس کو انجام دیتے رہے۔۔۔"[۲]

بعد میں جب جیل کا ڈاکٹر آیا تو اس نے داروغہ جیل کو از خود تنبیہ کی اور مولانا کو ایک دوسرے ہلکے کام پر لگایا گیا۔

اس کے بعد امتحان کا ایک دوسرا موقع آتا ہے۔ حکومت مولانا یحیی علیؒ کے بڑے بھائی مولانا احمد اللہؒ (ف در انڈمان ۱۲۹۸ھ) پر مقدمہ چلانا چاہتی ہے۔ انبالہ کے سزا یافتوں کو طرح طرح سے ورغلایا جا رہا ہے۔ محمد شفیع، عبدالکریم اور الٰہی بخش کے قدم ڈگمگا چکے ہیں۔ طرح طرح کی ترغیبیں دی جا رہی ہیں۔

---

[۱] تذکرہ صادقہ: ص ۷۱ [۲] تذکرہ صادقہ: ص ۷۲

"وہ عجیب وقت تھا کہ ادھر تو ہم لوگ انواع واقسام کے آلام ومصائب میں مبتلا اور پھر عذاب الجوع، اور ادھر وہ راحت وآرام وتنعم، گویا نمونۂ قیامت تھا کہ ایک طرف جنت اور دوسری طرف دوزخ نظروں کے سامنے رکھی تھی۔ وہ وقت پرلے سرے کی جانچ اور امتحان کا تھا۔ اس وقت پر آیۃ کریمہ وزلزلوا زلزالاً شدیداً کا مضمون خوب صادق آتا ہے۔ . . . ہر ذی ایمان ربّ سلّم سلّم، کہتا تھا۔ ہمارے حضرت باطمینان قلب نہایت خنداں و شاداں وفرحاں یاد الٰہی میں اور لوگوں کو استقامت دلانے میں شب و روز مصروف رہتے۔ دنیائے دوں کی بے ثباتی اور اس کے راحت و آرام کی بے قراری اور ثوابِ آخرت اور جنت نعیم کی پائداری یاد دلاتے اور رضوان من اللہ اکبر کو خوب کھول کر فرماتے[۱]۔ . . "

داستان طویل ہوتی جاتی ہے اور سخنہائے گفتنی کی کوئی حد نہیں۔ خام کار قلم حیران ہے، کیا چھوڑے اور کیا لکھے؟ بہرحال مولاناؒ کے صبر وشکر کی ایک اور مثال پیش کرکے یہ سلسلہ ختم کرتا ہوں۔

۱۸۶۵ء میں جب صادق پور کے مسکونہ مکانات اور قبریں تک کھود کر پھینک دی گئیں۔ تو اس وقت اچھوں اچھوں کے قدم لڑکھڑا گئے تھے اور اسیرانِ بلا کے لئے بھی صبر وضبط کا قائم رکھنا مشکل ہوگیا تھا۔ مولانا یحییٰ علیؒ کو اس "حادثے" کی خبر وہیں جزائر انڈمان میں ملتی ہے اور صبر وشکر کے ساتھ اپنی اہلیہ اور اہلِ خاندان کو صبر وضبط کی تلقین کرتے ہیں۔ مولاناؒ کے مکتوب کے اقتباسات پڑھئے اور کلیجہ پر ہاتھ رکھ کر سوچئے کہ ایسے میں ہمارا کیا حال ہوتا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"یحییٰ علی کی طرف سے بخدمت حبیبہ ام محمد یوسف[۲] سلمہ اللہ تعالیٰ.

---

[۱] تذکرہ صادقہ: ص ۸۴، [۲] شمس العلماء مولانا محمد یوسف صاحب رنجور عظیم آبادی (ف ۱۳۴۱ھ) خلف مولانا یحییٰ علیؒ

..... ضروری لکھنا یہ ہے کہ خط سے نور چشم محمد حسن مدعمرہٗ کے حالِ انہدام دونوں مکانوں کا معلوم ہوا۔ البتہ دل کو قلق ہوا اور صدمہ بہت گذرا، کیونکہ مکان سکونت قدیم سے خصوصاً وہ مکان کہ جس میں ذکر اللہ بہت ہوا ہو اور "کاروبار" فریضہ بہت اجرا پائے ہوں، مومنین کو انس و محبت بطور اہل وعیال کے ہوتی ہے۔ اسی روز شب کو زیارت روح انور سے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشرف ہوا، تبسم کناں فرمانے لگے۔

کہ البتہ انہدام سے مکانوں کے مالکان مکان کو خصوصاً نسواں کو رنج و الم بہت ہوا ہے اور ہونے کی جگہ ہے اور ان آیت کریمہ کو زبانِ مبارک سے ارشاد فرمایا : وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۞ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ۞[1] رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّتَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ ۞ عَسٰى رَبُّنَآ اَنْ يُّبْدِلَنَا خَيْرًا مِّنْهُمَآ اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا رٰغِبُوْنَ ۞[2]

اور فرمایا کہ ان آیتِ کریمہ کو وردِ زبان رکھو۔ عبادت خانے اور مسجد اقصیٰ اور مکانات انبیاء علیہم السلام بخت نصر اور جالوت کے ہاتھ سے انہدام پائے تھے۔ آخر منہدم کرنے والے نسیاً منسیاً ہوئے۔ اور یہ

---

[1] شمس العلماء محمد حسن صاحب ذبیح (ف ۱۳۰۷ھ) خلف مولانا ولایت علیؒ (ف ۱۲۶۹ھ)

[2] البقرۃ : ۱۵۲ - ۱۵۱ - پھر جو لوگ ایسے ہیں کہ صبر کرنے والے ہیں، تو انہیں (فتح و کامرانی کی) بشارت دے دو۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ جب کبھی کوئی مصیبت ان پر آپڑتی ہے تو ان کی زبانِ حال کی صدا یہ ہوتی ہے کہ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ، سو یقیناً ایسے ہی لوگ ہیں جن پر ان کے پروردگار کے الطاف و کرم ہیں اور جو اس کی رحمت کا مورد ہوتے ہیں اور یہی ہیں جو اپنے مقصد میں کامیاب ہیں۔

اے ہمارے پروردگار ہمیں صبر کی نعمت سے شادکام فرما اور ہمیں اسلام کی حالت میں اس دنیا سے اٹھا۔ شاید ہمارا پروردگار ہمیں اس کا اچھا بدل دے۔ ہم اپنے پروردگار کی طرف رجوع کرنے والے ہیں۔ (ترجمان القرآن)

متبرکہ ازسرِنو بنا ہوئے اور پہلے سے زیادہ آباد ہوئے۔ تم بھی اپنے رب کے فضل سے ایسا ہی اُمید رکھو۔ . . . اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ دشمنانِ خدا ان کے دوستوں کو اچھی طرح ستائیں۔ بعد اس کے اچھی طرح بدلہ پاویں۔ . . . . اللہ تعالیٰ کا بہت شکر کرو کہ تم ایسے امتحان کے لائق ٹھیرے۔". . .

. . . . بعد از فراغ اس مکاشفہ میں نے بہت انشراح وتسکین پایا۔ اور اپنے بڑے بھائی (مولانا احمد اللہؒ) کو آگاہ کیا ؎

دریائے عشقِ خالقِ دونوں جہاں میں ہم ۔۔۔ نام و نشان دار فنا کے ڈبا چکے
کفنی گلے میں ڈال کے، تسمہ کمر کے بیچ ۔۔۔ ہم جوگی ہوئے محرمِ اسرار کے لئے
اے خدائے من فدایت جانِ من ۔۔۔ جملہ فرزندانِ خان ومانِ من الخ

(اقتباس از مکتوب مورخہ ۱۲رجمادی الاولیٰ۔ روز یکشنبہ (۱۲۸۳ھ) ۱۸۶۶ء

آٹھواں باب

ظاہری ناکامی کے اسباب

کامیابی یا ناکامی؟

سید شہیدؒ. ان کے اصحابِ خاص اور ان کی جماعت کے کارنامے پڑھ کر ذہن میں پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے، کہ یہ تحریک ناکام کیوں ہوئی؟ اور جب ایسی جماعت جو اپنی سیرت اور کردار کے لحاظ سے صحابہ کرامؓ کی سیرت و کردار کا نمونہ تھی، ناکام رہی، تو پھر کسی دوسری جماعت کی کامیابی اور منزلِ مقصود تک پہنچنے کا کیا امکان ہے؟ یہ سوال پیدا ہونا طبعی بات ہے اور راقم سے اچھے اچھے اصحابِ علم[1] نے یہ سوال کیا ہے کہ سید صاحبؒ اور مولانا شہیدؒ کی ناکامی کے بعد اس راہ پر قدم بڑھانے کی جرأت کیسے پیدا ہو سکتی ہے؟ "حکومت علےٰ منهاج النبوۃ کا نام لینا آسان ہے، مگر کرنا مشکل۔" انھوں نے یہ طے کر لیا ہے کہ "اب[2] اللہ کی سرزمین پر اس کا نام سربلند ہو ہی نہیں سکتا۔" اب اسلام کا کام صرف یہ رہ گیا ہے کہ وہ کسی دوسری چلتی ہوئی تحریک کا ضمیمہ بن کر رہے۔ ناکامی کے اسی غیر اسلامی تصوّر نے ہمارے بعض مشہور اہلِ فکر کو مسلمانوں کی تقدیر DESTINY ہی سے مایوس کر دیا ہے۔ بعض دلوں میں مایوسی تجربہ اور استقرار کا چولا بدل کر کہتی ہے کہ یہ قوم اب عقیم

---

[1]، [2] یہ فرضی اقوال نہیں، بلکہ اسلامی ہند کے ممتاز ترین شخصیتوں کی رائیں ہیں۔ نام لینا مناسب نہیں، اور نہ اس کی ضرورت ہے۔

ہو چکی ہے۔

ایک خطا کار اور نا آشنائے راہ و رسم منزل، جب بزرگوں کی زبان سے یہ باتیں سُنتا ہے تو حیرت ہوتی ہے اور اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق صورت حال کے سمجھنے اور اس پیچیدہ گتھی کو سُلجھانے کی کوشش کرتا ہے۔

(۱) سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ ہماری کامیابی اور ناکامی کا تصور دنیا کے عام تصورات سے بالکل الگ ہے۔ ہم اس خاکدانِ ارضی میں 'عبد' بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ اپنے آقا اور مولا کی رضا مندی، اس کے احکام کی بجا آوری اور اس کا کلمہ بلند کرنے کی کوشش میں لگے رہیں۔ مقصود کا پا لینا ہمارا کام نہیں۔ ہمارا کام کوشش کرنا اور ذہنی و جسمانی قوتوں کو حرکت میں لاتے رہنا ہے۔ منزل تک پہنچانا اس کا کام ہے جس نے ہمیں اپنی اطاعت اور فرمانبرداری کے لئے دنیا میں غلام بنا کر بھیجا ہے۔ اس لئے ایک مومن قانت کے دل میں دنیوی کامیابی و ناکامی کا سوال پیدا ہی نہیں ہونا چاہیئے۔ اپنے مولا کی رضا میں لگے رہنا سو کامیابیوں کی ایک کامیابی ہے۔

(۱۱) دوسری چیز قابلِ غور یہ ہے کہ کیا یہ تحریک بالکل ناکام رہی؟ کیا شاہ ولی اللہؒ (ف ۱۱۷۶ھ) اور ان سے پہلے اسلامی ہند کی جو دینی حالت تھی، اس میں "شہیدین" اور ان کے اصحابِ باصفا کی کوششوں اور فداکاریوں سے کوئی فرق نہیں پیدا ہوا؟ کیا آج بھی بیوہ عورتوں کا نکاحِ ثانی اسی طرح معیوب و مذموم سمجھا جاتا ہے؟ کیا آج بھی بڑے بڑے علمی خاندانوں اور علمائے دین کے گھروں میں 'السلام علیکم' کے بدلے "آداب عرض" کی صدا بلند ہوتی ہے؟ کیا آج بھی خواص اور اہل علم و عمل طبقوں میں اجمیر اور دیوہ کی زیارت 'حج' کے برابر سمجھی جاتی ہے؟ اور کیا سو ڈیڑھ سو برس سے آج تک مسلسل مردان کار' کا ایک گروہ (خواہ کتنا ہی مختصر سہی) اللہ کے نام پر گھر بار لٹاتا نہیں رہا ہے؟ کیا آج بھی شرک و بدعات کی گرم بازاری کا وہی حال ہے؟ اور کیا "شہیدین" سے پہلے بھی برملا طریقے پر حکومتِ الٰہیہ اور خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کی صدائے عام سننے میں آتی تھی؟ ... اگر ان سب کا جواب اثبات میں ہے تو پھر ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ناکامی کسے کہتے ہیں، اور اگر اس کا

نام " ناکامی " ہے تو ایسی " ناکامی " پر ہماری ہزاروں کامیابیاں قربان ـــــ کہنا یہ ہے کہ حضرت سید شہیدؒ اور مولانا اسمٰعیل شہیدؒ اور ان کے اصحابِ خاص کی تحریکِ دعوت و جہاد سے " بحرِ ہند کی ساکن سطح میں جو تموج پیدا ہوا ہے، اس کی لہریں آج تک باقی ہیں اور " بزم آرائیاں " ساحل کو دریا کی موجوں سے ہم آغوش ہونے کی برابر دعوت دے رہی ہیں۔ اگر اس تحریک سے ہزاروں فیوض و برکات کے علاوہ صرف یہی ایک فائدہ ہوا ہوتا، تو بھی اسے ناکام نہیں کہا جا سکتا۔ ورنہ یہاں تو یہ حال ہے کہ موجودہ اسلامی زندگی کے جتنے روشن اور خوش منظر گوشے نظر آتے ہیں، سب کے سب اسی تحریک کے فیض سے مستفیض اور اسی کی روشنی سے اجاگر ہوئے ہیں۔

(iii) لیکن ہمیں اسی قدر پر قناعت نہیں کرنا ہے، بلکہ کمرِ ہمت کو چست باندھ کر محمل کو آگے بڑھانا ہے۔ اور اس کے لئے ضروری ہے کہ اس عظیم الشان تحریک کی ظاہری اور دنیوی کامیابی کی راہ میں جو دشواریاں، رکاوٹ ثابت ہوں، ان سے دامن بچا کر سفر شروع کیا جائے۔ نیز اس تحریک کے علم برداروں سے جو مسامحتیں یا فروگذاشتیں ہوئی ہوں، ان کا جائزہ لیا جائے اور آنے والوں یا ساتھ کے چلنے والوں کو ان سے آگاہ کر دیا جائے۔ ممکن ہے اس سے خوش عقیدہ لوگوں کو کچھ تکلیف بھی ہو، لیکن اگر اس ساری داستان سرائی سے مقصود محض " پدرم سلطان بود "، کا آموختہ پڑھنا نہیں ہے، تو پھر مستقبل کی کامیابی کے لئے ماضی کی کوتاہیوں اور فروگذاشتوں کا بے لاگ جائزہ لینا ضروری ہے۔

(الف) سب سے پہلی چیز جو سید صاحبؒ اور ان کے ساتھیوں کی تاریخ کے مطالعے سے واضح ہوتی ہے، وہ یہ کہ انھوں نے جس علاقے (ہندوستان کا سرحدی صوبہ اور ماورائے سرحد کا علاقہ) کو اپنا میدانِ عمل اور سرگرمیوں کا مرکز بنایا، وہاں کے باشندوں کی تعلیم و تربیت کا انھوں نے پیشتر سے کوئی انتظام نہیں کیا۔ فوری تبلیغ و ترغیب سے بعض قبیلے ہم نوا ہوئے، مگر جونہی موقع ملا، دھوکہ دینے میں انہیں ذرا بھی جھجک نہیں پیدا ہوئی۔ اور جب فتح پشاور کے بعد اسلامی قانون نافذ کیا گیا تو ان کی قبائلی عصبیت اور رچی بسی ہوئی جاہلیت بھڑک اٹھی۔ جس کے نتیجے میں مجاہدین کا قتلِ عام ہوا

ور جیتی ہوئی لڑائی شکست سے بدل گئی۔ قانونِ اسلامی کے نفاذ کے لئے مسلمان رعایا بھی مطلوب ہے۔ فاشستی یا ناستی آمریت کے نمونے پر الٰہی قانون پر عمل درآمد نہیں کرایا جا سکتا۔ اس کے لئے رعایا اور عام آبادی کی طرف سے تعاون اور لپک شرط ہے۔ مزید برآں یہ حقیقت بھی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونا چاہیے کہ اسلامی حکومت کی رعایا ایک دن میں نہیں بنتی۔ اس کے لئے مدتِ دراز تک دعوت و تبلیغ اور اس سلسلے میں اذیتوں کا برداشت کرنا ناگزیر ہے۔ خود حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں اس تدریج کا مکمل نمونہ موجود ہے۔

ایک عجیب بات یہ ہے کہ پشاور کے قتلِ عام اور خوانین کی غداری کے بعد بھی مجاہدین کو اپنی اس غلطی کا احساس نہیں ہوا اور وہ سالہا سال تک اسی علاقے[1] کو اپنی فداکاریوں کا مرکز بنائے رہے۔ حالانکہ انہیں ہر دور میں اور ہر لڑائی میں قبائل نے دھوکے دیئے۔ مولانا عنایت اللہ غازیؒ (ف ۱۲۷۴ھ، ۱۸۵۸ء) مولانا عبداللہؒ (ف ۱۳۲۰ھ، ۱۹۰۲ء) ہر ایک کو اس قسم کے دھچکے لگتے رہے، مگر انہوں نے ان علاقوں کو نہ چھوڑا اور نہ ان قبائل کی باضابطہ اسلامی تربیت کی طرف توجہ کی۔ بہت ممکن ہے کہ مولانا ولایت علیؒ (ف ۱۲۶۹ھ، ۱۸۵۲ء) کے بعد اسلامی انقلاب کا صحیح تصور بھی ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا ہو۔

قبائل کی مسلسل غداریوں کے باوجود ان علاقوں میں "مجاہدین مرابطین" کے جمع رہنے کی ایک وجہ اور سمجھ میں آتی ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ مقدمہ سازش انبالہ (۱۲۸۰ھ، ۱۸۶۴ء) تک اہل صادق پور، اصحاب قافلہ (ٹونک) اور عام مجاہدین و معتقدین پر سید صاحبؒ کی

---

[1] پشاور کے قتلِ عام کے بعد سید صاحب پنجتار کو چھوڑ کر راج دواری میں چلے گئے اور خوانین کے اظہارِ پشیمانی کے باوجود اس مرکز سے کنارہ کشی اختیار کر لی، جہاں چار سال صرف کر چکے تھے۔ لیکن یہ علاقہ کم و بیش یکساں تھا۔ عوام کی کوئی تربیت نہیں ہوئی تھی۔ فوری جوش یا مالِ غنیمت اور دنیوی جاہ و حشم کی طمع میں وہ ساتھ دیا کرتے تھے۔

شہادت کا مسئلہ واضح نہیں ہوا تھا اور وہ شمالی مغربی پہاڑیوں سے سید شہیدؒ کے دوبارہ ظہور کی توقع رکھتے تھے۔ ممکن ہے، خوانین وقبائل کی غداری کے باوجود ان پہاڑ علاقوں میں جمع رہنے پر اس خیال کا بھی دخل ہو۔ یہ راقم کی ذاتی رائے ہے، جس پر اصرار نہیں۔

(ب) دوسری اہم چیز جو اس دعوت اور اس کے ماننے والوں کی سیرت کی کھٹکتی ہے، وہ ان کا امیر کی ذات میں غلو ہے۔ اور عجیب تر بات یہ ہے کہ مولانا اسمٰعیل شہید جیسے عالم اور مجاہد بھی حضرت سید شہیدؒ کے متعلق ایسے القاب[1] و الفاظ استعمال کرتے ہیں کہ پڑھ کر خیال ہوتا ہے "کہیں کسی معصوم کی توصیف تو نہیں بیان کی جا رہی ہے؟" شخصیت میں غلو کا نتیجہ یہ ہوا کہ سید صاحبؒ کی شہادت کے بعد ہی "غیبوبت" کا شاخسانہ کھڑا ہو گیا۔ اور اس میں بڑے بڑے عالموں اور مجاہدوں کے قدم لڑکھڑا گئے۔ مولانا ولایت علیؒ، مولانا یحییٰ علیؒ اور بیسیوں متبعِ سنت عالم اس عقیدے کے قائل ہو گئے تھے۔—— مولانا یحییٰ علیؒ (جو اپنی استقامت اور عمل کے لحاظ سے امام احمد بن حنبلؒ کا نمونہ تھے) غالباً آخر تک سید صاحبؒ کی غیبوبت کے قائل رہے۔ مشہور ہے کہ پھانسی گھر میں وہ دردؔ کے یہ شعر بڑے ذوق وشوق سے پڑھا کرتے تھے:۔

جب صبا کوئے یار میں گزرے —— اتنا پیغام دردؔ کا کہنا
دن بہت انتظار میں گزرے —— کون سی رات آپ آئیں گے

نیز ان کے اس تاریخی مکتوب میں جو انہوں نے جزائرِ انڈمان سے مکاناتِ مسکونہ

---

[1] ملاحظہ ہو دیباچہ صراطِ مستقیم:۔ "امابعد می گوید۔ ۔ ۔ ۔ بندۂ ضعیف محمد اسمٰعیل کہ نعم الٰہی دوبارہ این ضعیف نامتناہی است و از اعاظم آں حضور محفل ہدایت منزل ملا زمان فخرِ خاندان سیادت مرجع اربابِ ہدایت مرکزِ دائرہ ولایت دلیلِ سبیل فلاح ورشاد، رہنمائے طریقِ استقامت وسداد، مظہر انوارِ نبوی، منبع آثارِ مصطفوی، سلالۂ خاندان صلب طاہر۔ ۔ ۔ مقتدائے اصحابِ شریعت پیشوائے اربابِ طریقت، ہادی زمانہ مرشد یگانہ، سراج المحبین، تاج المحبوبین، الامام الاوحد السید احمد متع اللّٰہ المسلمین بطول بقائہ ونفعنا وسائر الطالبین، باقوالہ و احوالہ الخ۔

کے انہدام کی خبر سُن کر لکھا تھا (جس کا ایک ٹکڑا اوپر درج کیا جا چکا ہے۔) یہ فقرے بھی ملتے ہیں :۔

. . . . زیارتِ ارواحِ متبرکہ سے حضرت علی مرتضیٰ و حسنین رضی اللہ عنہم کے میں مشرف ہوا۔ حضرات ثلاثہ کو بہت منور دیکھا۔ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ میر انشاء اللہ خاں کو کہہ دو کہ تو بھی میری اولاد سے ہے، اور مہدی جو واسطے ادفاع منافقین ملاعنہ کے کوہستان' خراسان میں موجود ہے ـــــ عنقریب نکلے گا اور قلع قمع منافقین ملاعنہ کا کرے گا۔

مولوی جعفر صاحب تھانیسری کی سوانح 'احمدی' کے دیباچے میں بھی مہدی وسط کا لفظ آتا ہے، گو ذرا احتیاط کے ساتھ۔ رسالہ اربعین فی المہدیین بھی اس طرح ترتیب دیا گیا ہے کہ خواہ مخواہ ذہن سید صاحبؒ کی مہدویت کی طرف منتقل ہو۔

یہ سب غلو اور حد سے بڑھی ہوئی عقیدت کا نتیجہ تھا۔ اسلام میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی کی ذات معصوم نہیں۔ امام دار الہجرۃ سیدنا مالک بن انس (ف ۱۷۹ھ) نے سچ کہا ہے :۔

کل واحد یوخذ منه و یرد علیه الا صاحب ھذا القبر صلی اللہ علیه وسلم

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا ہر شخص کے اقوال میں رد و قبول کی گنجائش ہے۔

(ج) تیسری نمایاں چیز جو اس پہلی اسلامی تحریک کے علم برداروں میں کھٹکتی ہے وہ ان کا متصوفانہ اندازِ بیان اور طریقِ عمل ہے۔ حاشا کہ راقم کو تصوف کی روح اور جوہر سے انکار نہیں اور حضرت مجددؒ الف ثانی (ف ۱۰۳۴ھ اور شاہ ولی اللہ دہلوی (ف ۱۱۷۶ھ) جیسے بزرگوں نے تصوف کے نام سے جو چیز پیش کی، گو وہ اپنی روح اور جوہر کے لحاظ سے اسلامی 'احسان' سے الگ نہیں تھی، لیکن انھوں نے اظہارِ مطلب کے لئے جو زبان اور اصطلاح اختیار کی وہ وہی تھی جس کے ذریعے عرصۂ دراز سے تصوفِ باطل کی ترویج ہو رہی تھی۔ حضرت مجددؒ نے تو ابن عربیؒ (ف ۶۳۸ھ) کے گمراہ کن نظریوں پر سخت ضرب بھی لگائی، مگر شاہ صاحبؒ نے مجددؒ صاحب اور ابن عربی کے نظریوں کے درمیان تطبیق دے کر عقیدۂ وحدت الوجود کو سند جواز عطا کر دی۔ حضرت سید شہیدؒ کے رفیق

خاص مولانا شہیدؒ نے البتہ امام ابن تیمیہؒ (ف ۷۲۸ھ) کی طرح ٹھیٹھ توحیدی طریقہ اختیار کیا۔ عبقات میں تو وہ اپنے دادا کے رنگ پر معلوم ہوتے ہیں۔ مگر صراطِ مستقیم میں سید صاحبؒ کا رنگ جھلکتا ہے اور وہ وحدت الوجود سے بیزار نظر آتے ہیں۔ مگر خود سید صاحب کی ذات کے ساتھ کرامات اور خرق عادات اور مکاشفات کا اتنا بڑا سلسلہ وابستہ کر دیا گیا کہ شہیدینؒ کی شہادت کے بعد ہی یہ جماعت اندھی عقیدت کا شکار ہو گئی۔ کچھ تو عقیدۂ غیبوبت کے قائل ہو گئے اور گاہے گاہے انہیں سید صاحبؒ کا سلام بھی پہنچنے لگا اور پیری مریدی سے تو بہت کم لوگ بچ سکے، بدعات سے نفرت، اہلِ حدیثیت اور جذبۂ جہاد کے ساتھ ساتھ ان کے ہاں مراقبہ ہونا، "توجہ" دی جاتی۔ مکاشفات بیان کئے جاتے۔ اور "کشفِ قبور" وغیرہ میں مہارت پیدا کی جاتی[1] نتیجہ معلوم ہ متبعین سنت اور مجاہدوں کے ماننے والوں میں بھی "بہ مے سجادہ رنگیں کن، گرت پیرِ مغاں گوید" کا انداز پیدا ہو گیا ـــــ تمام اسلامی دنیا اور خاص کر ہندوستان میں تصوف کے موجودہ قالب نے دین اور دینی تحریکوں کو اتنا نقصان پہنچایا ہے کہ اب صرف اس لئے بھی یہ قالب قابلِ

---

[1] مولانا عبدالرحیم صاحب (ف ۱۳۴۱ھ) مولانا یحییٰ علی (ف ۱۲۸۴ھ، ۱۸۶۸ء) کے حال میں لکھتے ہیں:

"فیضِ باطنی بھی علی وجہ الاتم آپ نے پایا۔ آپ کے مراقبے کی یہ کیفیت تھی کہ جب کبھی آپ چادر اوڑھ کر بیٹھ جاتے فی الفور آپ کو مراقبہ کھل جاتا۔ انبیاء و اولیاء کی زیارت ہوتی، ان سے گفتگو ہوتی۔ ان سے حلِ مطالب فرماتے۔ کشف قبور میں بھی آپ کو ملکہ تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" (تذکرہ صادقہ: ص ۶۴)

پھر دوسری جگہ اپنے والد ماجد مولانا فرحت حسین (ف ۱۲۷۴ھ) کے حال میں رقم طراز ہیں "جناب مولانا یحییٰ علی علیہ الرحمۃ کو جب کہ آپ ملک افغانستان میں تھے، بعد انتقال بڑے حضرت کے (مولانا ولایت علی (ف ۱۲۶۹ھ) مراقبہ میں مشاہدۂ باری و زیارت انبیاء و اولیاء و بزرگانِ دین بند ہو گیا۔ جب آپ وہاں سے پٹنہ تشریف لائے، جناب چھوٹے حضرت نے ان کو بٹھا کر توجہ دی تب مراقبہ میں مشاہدہ و زیارت وغیرہ حسبِ دستور جاری ہو گیا۔

(تذکرہ صادقہ: ص ۱۴۳)

ترک ہوگیا ہے۔ "تورع"، "زہد"، "عبادات"، "تہجد گزاری"، اللہ کی یاد ___ کسی چیز سے انکار نہیں، یہ چیزیں محمود تھیں۔ اور ہمیشہ محمود رہیں گی۔ مگر پیری مریدی کا یہ غیر ماثور طریقہ اب قطعی طور پر قابلِ ترک ہوگیا ہے۔ اور یہ طریقہ تو تزکیہ کے ذریعہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ جب یہ چیز واضح ہو چکی کہ یہ طریقہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں، تو پھر اس کے ترک کرنے میں کونسی چیز مانع ہے۔؟

(د) ایک آخری بات اس باب میں اور قابلِ غور ہے۔ سید شہیدؒ اور ان کے اصحابؓ خاص نے اپنے زمانہ کے حالات کے مطابق اسلامی انقلاب برپا کرنے کی کوشش کی، اور ان کا طریقۂ کار اس زمانے کے لحاظ سے ایک حد تک ٹھیک بھی تھا۔ مگر اب کہ حالات بدل چکے ہیں۔ لکیر کا فقیر بنا رہنا مناسب نہیں۔ کتاب و سنت کی روشنی میں اور اللہ تعالیٰ کی توفیق و ہدایت سے نئے حالات اور نئے مقتضیات کے مطابق مکمل اسلامی انقلاب و تجدید کا خاکہ بنا کر گامزن ہونا چاہیئے۔ اب صرف قتال یا صرف عبادت و زہد کی روح کا بیدار کرنا کافی نہیں۔ ان چیزوں کے ساتھ ساتھ زندگی کے تمام شعبوں میں جاہلیت کے مقابلے کی تیاری کرنا چاہیئے۔ آج کفر کے حملے کسی ایک مورچے پر محدود نہیں۔ ہر آنے والی سانس کفر کے جراثیم سینوں میں داخل کر رہی ہے۔ فضا آلودہ اور زہریلی گیسوں سے مسموم ہے۔ اس کے مقابلے کے لئے مکمل اور ہر جہتی پروگرام کی ضرورت ہے۔ نمرود کی آگ آج ہر کوچہ و بازار میں بھڑک رہی ہے۔ لیکن اولادِ ابراہیمؑ کو شاید اس کی خبر بھی نہیں۔ طاغوتی طاقتوں کا پرچم کوہ و دشت، ویرانہ اور آبادی، ہر جگہ لہرا رہا ہے۔ کون ہے اللہ کا بندہ جو بڑھ کر حق اور ایمان باللہ کا علم بلند کرے ؟

ہر طرف سے هَلْ مِنْ مبارز ؟ هل من مجیب ؟ کی گونج سنائی دیتی ہے۔ کون ہے، جو لبیک کہے ؟

کتابیات

فارسی

۱۔ صراطِ مستقیم — مولانا اسماعیل شہیدؒ (ش ۱۲۴۶ھ)

۲۔ اجازت نامے — صادق پور سے سید صاحبؒ کے بعضے ایسے اجازت نامے دستیاب ہوئے جواب تک کہیں طبع نہیں ہوئے، اور جن سے سید شہیدؒ کی تعلیم اور طریقِ تزکیہ پر خاصی روشنی پڑتی ہے۔

۳۔ مخزنِ احمدی (قلمی) مصنفہ مولوی سید محمد علی صاحب (ف ۱۲۶۶ھ) خواہرزادہ وخلیفہ حضرت سید شہیدؒ (مخلوط اورنٹیل پبلک لائبریری، پٹنہ ۱۳۸۵)

۴۔ حالاتِ مولوی عنایت علی یا اعلام نامہ (قلمی) یہ ایک اپیل ہے جو مجاہدین مقیم سرحد نے مسلمانانِ ہند کے نام بھیجی تھی، مورخہ ۱۲۶۲ھ، کاتب کا نام امام علی درج ہے (مخطوط کتاب خانہ آصفیہ، حیدرآباد)

۵۔ اتحاف النبلاء — نواب صدیق حسن خاں (ف ۱۳۰۷ھ) محدثین وفقہاء کے تذکرے میں مشہور کتاب ہے۔ اس میں مولانا شہیدؒ اور اس سلسلے کے بعض دوسرے حضرات کے حالات بھی درج ہیں۔

۶۔ مثنوی شہرِ آشوب — حکیم عبدالحمید عظیم آبادی (ف ۱۳۱۲ھ)

۷۔ الاقتصاد فی مسائل الجہاد — مصنفہ مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی (ف ۱۳۳۸ھ) اس رسالے میں جہاد کو منسوخ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مطبوعہ ۱۳۰۶ھ، ۱۸۸۸ء۔ اردو، انگریزی، عربی میں اس کے ترجمے بھی شائع ہوئے اور انگریزی

اور اردو ترجمے سر چارلس ایٹیکسن[1] اور سر جیمس لائل گورنران پنجاب کے نام معنون کیے گئے۔

اس کی تالیف ۱۲۹۳ھ میں ہوئی۔ علمائے عصر سے رائے لینے کے بعد ۱۲۹۶ھ میں رسالہ اشاعت السنہ میں شائع کیا گیا (جلد ۲ ، ۱۱ ضمیمہ) پھر مزید مشورہ و تحقیق کے بعد ۱۳۰۶ھ میں باضابطہ کتابی صورت میں اس کی اشاعت ہوئی۔

اللہ مرحوم کی مغفرت کرے۔ اس کتاب پر انعام سے کبھی سرفراز ہوئے تھے۔ جماعت اہلِ حدیث کو فرقہ کی شکل دینے میں ان کا خاص حصہ ہے۔ اور یہ ہی وہ بزرگ ہیں جنھوں نے اس سادہ لوح فرقے میں وفاداری کی خوبو پیدا کی۔ نہ صرف یہ بلکہ دوسرے معاصر علماء کو سرکار کی مخالفت کے طعنے بھی دئے۔

اُردو

رسائل تسعہ ــــ از مولانا ولایت علی (ف ۱۲۶۹ھ) اسی مجموعے میں رسالۂ دعوت اور رسالۂ اربعین بھی ہیں۔ رسالۂ دعوت میں صاف صاف عقیدہ غیبوبیت کا اظہار ہے اور رسالہ اربعین میں خروج مہدی کے متعلق چالیس حدیثیں جمع کر دی گئی ہیں۔ مگر سید صاحب کا نام کہیں نہیں لیا گیا ہے۔ یہ مجموعہ مولوی الٰہی بخش صاحب بڑاکری عظیم آبادی (ف ۱۳۳۴ھ) کے اردو ترجمے کے ساتھ چھپا ہے۔

ترجمانِ وہابیہ ــــ نواب صدیق حسن خاں صاحب (ف ۱۳۰۷ھ) اس میں بدنام وہابیوں کے متعلق طرح طرح کی دلچسپ باتیں کہی گئی ہیں جو اصلیت سے دُور ہیں۔

ابقاء المنن بالقاء المحن ــــ نواب صدیق حسن خاں (ف ۱۳۰۷ھ)

---

[1] حتی الوسع کتابوں کے نام تاریخی ترتیب سے دیے گئے ہیں۔ اردو اور انگریزی ماٰخذ میں بھی یہی ترتیب ملحوظ ہے۔

تواریخِ عجیب (طبع دوم) مولوی محمد جعفر صاحب تھانیسری (ف ۱۹۰۵ء) مصنف سید صاحب رح کی جماعت سے خاص تعلق رکھتے تھے۔ غالباً انہیں ولایت علی (ف ۱۲۶۹ھ) سے بیعت تھی۔ ۱۲۸۰ھ، ۱۸۶۴ء کے مقدمہ سازش انبالہ میں ماخوذ ہوئے اور حبسِ دوام کی سزا ملی۔ اور جزائر انڈمان بھیجے گئے۔ ۱۳۰۰ھ، ۱۸۸۳ء میں لارڈ رپن (۱۸۸۰ء — ۱۸۸۴ء) کے حکم سے رہا ہوئے۔ واپسی کے بعد یہ کتاب لکھی۔ نام تاریخی ہے (۱۳۰۲ھ) یہ کالا پانی کے نام سے بھی مشہور ہے۔ اس میں مصنف نے مقدمہ کی روداد اور ابتلاء و آزمائش کی سرگزشت، جہاں تک ممکن ہو سکا ہے، قلم بند کرنے کی کوشش کی ہے۔

سوانح احمدی (مطبوعہ صوفی کمپنی) مولوی محمد جعفر صاحب تھانیسری اس میں حضرت سید صاحب رح کے حالاتِ زندگی، جہاد اور تعلیمات کا خلاصہ درج ہے۔ مشہور خلفاء کا بھی تذکرہ ہے، نیز اخیر میں سید صاحب رح کے مکتوبات بھی دیئے گئے ہیں۔ یہ اردو زبان میں سید شہید رح کی سب سے پہلی مرتب سیرت ہے۔ تواریخِ عجیب کے پانچ سال بعد لکھی گئی۔ تاریخی نام تواریخ عجیبہ ہے[1]

تذکرہ صادقہ (طبع دوم) مولانا عبد الرحیم صادق پوری (ف ۱۳۴۱ھ) مولانا ولایت علی رح (ف ۱۲۶۹ھ) کے بھتیجے اور مولانا فرحت حسین رح (ف ۱۲۷۴ھ) کے صاحبزادے اور اخیر دور میں خاندان صادق پور کے گوہر شب چراغ تھے۔ ۱۸۶۴ء کے مقدمہ سازش میں ماخوذ ہوئے، حبس دوام بعبور دریائے شور سے نوازے گئے۔ ۱۸۸۳ء میں رہا ہوئے۔ رہائی کے بعد بھی چالیس برس سے زیادہ حیات پائی۔ یہ کتاب نہایت پریشان کن حالت

---

[1] مولوی محمد جعفر صاحب نے ایک کتاب تاریخ عجیب بھی لکھی تھی جس میں صرف جزائر انڈمان کے جغرافی حالات سے بحث کی گئی ہے۔ راقم کی نظر سے نہیں گذری۔ یہ ایک باخبر صاحبِ علم کی روایت ہے۔ راو نشانے ان کے روزنامچہ نصائح جعفری کا بھی ذکر کیا ہے۔ ڈائری کا آغاز سہ شنبہ ۱۸ ذی الحجہ ۱۲۷۸ھ سے ہوتا ہے۔ یعنی مقدمہ انبالہ سے دو برس پہلے۔ اس کتاب کا اور کسی دوسرے ذریعہ سے پتہ نہیں چلا۔

میں لکھی گئی۔ اور الہ آباد میں چھپی، معلومات بہت قیمتی ہیں، مگر بکھرے ہوئے۔ جابجا ایسے اشارات ہیں کہ اچھے واقف کار کے سوا کوئی سمجھ نہیں سکتا۔ راقم کو حسنِ اتفاق سے صادق پور (عظیم آباد) کے ایک صاحبِ علم کا ذاتی نسخہ مستعار مل گیا۔ جس میں انھوں نے "بین السطوری" اشارات کی توضیح و تشریح نیز بعض نئے معلومات کا اضافہ کیا تھا۔ اس سے بہت مدد ملی اور خاص کر "غیروں" کے مبالغہ آمیز بیانات کی جانچ پرکھ میں ان "حواشی" نے بہت کام دیا۔

رسالہ اشاعت السنۃ — مرتبہ مولوی محمد حسین بٹالوی (ف ۱۳۳۸ھ) افسوس کہ اس رسالہ کا مکمل فائدہ نہیں دستیاب ہو سکا۔ ورنہ مفید معلومات ملتیں۔

ارمغانِ احباب — مولانا حکیم سید عبدالحی مرحوم ناظم ندوۃ العلماء (ف ۱۳۴۱ھ، ۱۹۲۳ء) نے اپنے علمی سفر کی روداد قلم بند کی ہے (۱۳۱۲ھ) اس میں جماعت کے متعلق مفید معلومات ملتی ہیں۔ (معارف:- فروری۔ جون ۳۹ء)

تذکرہ — مولانا ابوالکلام آزاد مدظلہ کی مشہور اور لازوال تصنیف۔

تراجم علمائے حدیث ہند — ابو یحییٰ محمد امام خاں نوشہروی۔

سیرت سید احمد شہید (طبع دوم) مولانا ابوالحسن علی حسنی ندوی۔

انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ — عبداللہ یوسف علی۔

ولی اللہ نمبر (الفرقان) مرتبہ: مولانا محمد منظور نعمانی

تجدید و احیائے دین — مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک — مولانا عبید اللہ سندھی (ف ۱۳۶۳ھ، ۱۹۴۴ء)

مولانا سندھی اور انکے افکار و خیالات پر ایک نظر — مسعود عالم ندوی

محمد بن عبدالوہاب — ایک مظلوم اور بدنام مصلح: مسعود عالم ندوی (معارف مئی، جون ۱۹۴۱ء)

وہابیت — ایک دینی و سیاسی تحریک: مسعود عالم ندوی (الہلال۔ مئی، جون ۳۷ء)

شاہ اسمٰعیل شہید (مجموعہ مقالات اُردو) - مرتبہ: عبداللہ بٹ

انگریزی

1. A History of the Sikhs
Joseph Davey Cunningham, London, 1849.

2. Correspondences connected with Removal of W. Taylor from the commissionership of Patna, Calcutta, 1858.

3. A General Report on the Yusfzais
- H.W. Bellow, Lahore, 1864.

4. Memorandum
by T.E. Ravenshaw and the judgements of Mr. W. Aibalin, the sessions judge, Patna and of the High Court (Calcutta Gazette's Supplement, dated the 20th September, 1865).

5. Nine Years on the North West Frontier of India.
- Sydney Cotton London 1868.

6. The Indian Musalmans
- W.W. Hunter.

نیا ایڈیشن کلکتہ

7. The Wahabie Trial at Patna, 1871

سرکاری رپورٹ سنہ طباعت درج نہیں ہے۔

8. The Wahabis in India
- James Okinealy (Calcutta Review, 18.10.71)

9. Sir Saiyid on Dr. Hunter's
Our Indian Mussalmans, London, 1872

10. Notes on Muhammadnism
T.P. Hughes, London, 1877

11. The History of the Wahabys in Arabia and in India E.Rehatsek (J.R.A.S.Bo.) Vol.IV.1880.

12. Thirty-Eight Years in India
- William Taylor, London, 1882.

13. History of the Punjab
Sayyid Muhammad Latif, Calcutta, 1891.

14. Bengal under the Lieutenant Governors
- C.E.Buckland, Calcutta, 1901

15. Behar Legislative Assembly Proceedings
(the 16th March, 1939)

16. Shah Ismail Shaheed
Abdullah Butt Lahore, 1943

17. Encyclopaedia of Islam:

خاص بلمہاروٹ Blumhardt کا مقالہ احمد

مارگولیوتھ کا مقالہ Wahhabiyah

عبداللہ یوسف علی کا مضمون کرامت علی ہدایت حسین کا مضمون فرائضی۔
ڈاکٹر شفاعت احمد خاں کا مقالہ Maharaja Ranjit Singh
لیڈر الہ آباد ۳۰ جون ۳۹ء

ڈاکٹر محمود حسین کا مقالہ :

The Politics of the Indian Wahabis
مارننگ نیوز کلکتہ عید نمبر ۱۹۴۴ء